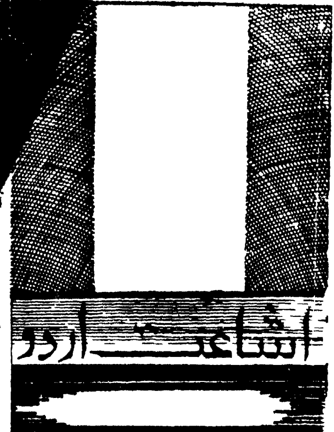
پیامِ ادب



اکتوبر، نومبر، دسمبر سنہ ۱۹۴۴ء
جنوری سنہ ۱۹۴۵ء

رجسٹرڈ آصفیہ نمبر ۱۹۸

جلد (۲)
نمبر ۸، ۹، ۱۰، ۱۱

ادارۂ تحریر
سید عبدالوہاب
(چوہدری) محمد اقبال سلیم گاہندری

مندرجات

چندہ سالانہ چھ روپیہ کلدار فی پرچہ آٹھ آنہ کلدار

نمبر	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۱	اشارات	(چوہدری) محمد اقبال سلیم گاہندری	۲و۳
۲	نئی کتابیں		۴
۳	لالۂ صحراء	علامہ اقبال	۵
۴	فریب مسلسل	تسنیم سلیم چھتاری	۶
۵	غزل	نواب فصاحت جنگ جلیل	۱۰
۶	حضرت آسی کا تغزل	مجنوں گورکھپوری	۱۱
۷	سراپا	صمد ساز رضوی	۲۷
۸	بھگوان اور بیل	شیر محمد اختر	۲۸
۹	غزل	سکندر علی وجد	۳۱
۱۰	لال چندری	تسنیم مینائی	۳۲
۱۱	عقیدت کے پھول	ماہر القادری	۳۵
۱۲	سامان جنگ	قیسی رامپوری	۳۶
۱۳	جذبات	جذب عالمپوری	۴۲
۱۴	اشتہارات	ادارہ اشاعت اردو	۴۴

اشارات

"پیام ادب" کا یہ شمارہ ایک طویل غیر حاضری کے بعد آج پیش ہو رہا ہے۔ ہمیں افسوس ہے اور شدید افسوس کہ "پیام ادب" جس کی پابندی اوقات، اور نظم اشاعت ہمیشہ ایک قابل فخر خصوصیت رہی۔ جدید، بہتر اور زیادہ محکم انتظام کے انتظار میں اپنے قدر دانوں کے لئے طویل غیر حاضری کی بنا پر تکلیف دہ بن گیا۔ لیکن کیا کیا جائے کہ حالات اور مواقع ایسے بھی ہوتے ہیں۔ ہم نے کوشش کی کہ اس کی حاضری کو زیادہ مقرر بنا سکے۔ بے کسی قدر غیر حاضری برداشت کر لی جائے۔ مگر اس پر آشوب زمانہ میں یہ کوششیں بڑی دیر سے بارآور ہوئیں۔ اور ہم آج سے پہلے رسالہ نہ پیش کر سکے۔ اب امید ہے کہ انشاء اللہ اس کی پابندی وقت میں فرق نہ آنے دیا جائے گا۔

ہماری کوششیں ہرگز بارآور نہ ہوتیں اگر مولوی سید عبدالرزاق صاحب مالک ادارۂ اشاعت اردو و اعظم اسٹیم پریس کی حوصلہ مند طبیعت اور ان کا بے پناہ جذبۂ خدمت ادب ساتھ نہ دیتا۔ موصوف نہ صرف ایک ماہر طباعت ہیں۔ اور نہ صرف جنوبی ہند کے سب سے پہلے ناشر و کتب فروش کی حیثیت سے ایک ممتاز و رفیع مقام رکھتے ہیں۔ بلکہ اپنے حساس قلب میں خدمت علم و ادب کا بے پناہ جذبہ بھی رکھتے ہیں۔ اور چونکہ ایک طابع و ناشر کو جن امور پر قابو حاصل رہنا چاہیے۔ ان پر قابو رکھتے ہیں۔ جنوبی ہند کے سب سے ترقی یافتہ اور عظیم الشان مطبع کے مالک ہیں۔ اس لئے اُن کا جذبۂ خدمت علم و ادب کے لئے ہمیشہ مفید و معین ثابت ہوتا ہے۔

ادارۂ اشاعت القرآن

مولوی سید عبدالرزاق صاحب نے اس کو محسوس کیا کہ کاغذ و سامان طباعت کی گرانی نے کتب فروشوں کو اس کا موقع پیدا کر دیا ہے کہ قرآن حکیم کے ہدیہ میں من مانے اضافے کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج قرآن کریم کے نسخے بڑے ہی گراں ہدیہ میں میسر آتے ہیں۔ اور غریب مسلمان کے لئے انہیں حاصل کر کے کسب نور کرنا دشوار ہو گیا۔ یہی حال دوسری مذہبی کتابوں کا ہے — اس ضرورت کا احساس کرنے کے بعد موصوف نے بڑی جرأت و ہمت کے ساتھ ایک ادارہ اشاعت القرآن کے نام سے قائم کرنے کا فیصلہ کیا — ماہ فروری میں فضیلت مآب حافظ قرآن مجید نواب صاحب چھتاری صدر اعظم دولت اسلامیہ آصفیہ، اپنے دست حق پرست سے اس کا افتتاح فرمائیں گے۔ امید ہے کہ قرآن مجید کے صحیح ترین نسخے اور مذہبی کتابیں اس کے بعد آسانی کے ساتھ دستیاب ہو سکیں گی۔ اس ادارے کو مفید تر بنانے کے لئے علمائے کرام اور محققین عظام کی ایک مشاورتی مجلس بنائی گئی ہے جو ہمیشہ اس ادارہ کو مفید تر مشورہ دیتی رہے گی۔

اقبالیات

علامہ اقبال، خودی کے پیغامبر، اور وہ عظیم الشان فلسفی تھے جن کے متعلق ہم جتنا زیادہ لکھیں کم ہے۔ ادارہ اشاعت اردو نے طے کیا ہے۔ کہ علامہ اقبال کی تعلیمات سے متعلق بیش بہا کتابوں کا ایک مفید سلسلہ پیش کرے۔ اب تک اس سلسلہ کی تین کتابیں

۱ - روح اقبال - مصنفہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں - پروفیسر جامعہ عثمانیہ۔

۲ - آئینۂ اقبال - مؤلفہ غلام دستگیر رشید ایم اے پروفیسر نظام کالج

۳۔ فکرِ اقبال۔ مؤلفہ غلام دستگیر رشید ایم۔ اے پروفیسر نظام کالج۔

پیش کی جا چکی ہیں۔ ان میں سے ہر کتاب اپنے معیار کی بلندی، افادیت کی وسعت اور علمی وزن کے اعتبار سے اپنا آپ ہی جواب ہے۔ انشاء اللہ اس سلسلہ میں حسبِ ذیل کتابیں عنقریب پیش کی جائیں گی۔

حکمتِ اقبال
مقامِ اقبال۔
اقبال کا فلسفۂ خودی
تصوراتِ اقبال۔

امید ہے کہ اس طرح یہ سلسلہ اقبال کے سمجھنے کے لئے ایک مکمل سلسلہ ثابت ہوگا۔ اور متعلمینِ اقبال کو کسی اور طرف نظر کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔

اس ماہ کے مضامین

"پیام ادب" کی روایات کے مطابق اس ماہ کے مضامین نظم و نثر بھی اپنی افادیت اور اپنے معیار کی بلندی میں ایک خاص مقام رفیع رکھتے ہیں۔ نثر میں حضرت مجنوں گورکھپوری کا مضمون "حضرت آسی کا تغزل" تنقید غزل پر بہترین مضمون ہے۔ حضرت مجنوں ہماری زبان کے بہترین تنقید نگاروں میں سے ہیں۔ اور اتنے مشہور و معروف صاحبِ قلم ہیں کہ ہمیں ان کا تعارف کرانے کی نہ جرأت ہے اور نہ ضرورت

"فریبِ مسلسل" کے نام سے تسنیم سلیم چھتاری کا لکھا ہوا افسانہ پیش ہے۔ اردو زبان میں فسانہ نگار خواتین اور بھی ہیں لیکن تسنیم کی تحریر میں ایک خاص انداز پایا جاتا ہے۔ 'زبان کی گھلاوٹ' اور 'فقروں کی چستی' کے ساتھ ساتھ اندازِ بیان کی دلآویزی تسنیم کو امتیاز دیتی ہے۔

"بھگوان اور بیل" بچوں کی نفسیات اور دوسری متعدد کتابوں کے مشہور مصنف جناب شیر محمد اختر کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے اور "مشک آنست کہ خود ببوید" کا مقام رکھتا ہے۔

"سامانِ جنگ" اردو زبان کے مشہور ناول نگار قیسی رامپوری نے لکھا ہے۔ اور ہر اعتبار سے کامیاب لکھا ہے۔

مضامینِ نظم میں حضرت اقبال کی ایک نظم "لالۂ صحرا" شائع کی جا رہی ہے۔ ارادہ ہے کہ ہر شمارہ میں اقبال کی کوئی نہ کوئی چیز ضرور شائع کی جائے۔ تاکہ ناظرین کو اقبال کے کلام سے بار بار لطف اندوز ہونے کا موقع ملے زمانہ کی رفتار سے اقبال کا کلام پرانا نہیں ہو سکتا۔ وہ اب بھی جدید ہے۔ اور ہمیشہ جدید ہی رہے گا۔

اس کے علاوہ صفدر رضوی کی نظم "سراپا" کامیاب، دلچسپ اور زورِ قلم کا بہترین نمونہ ہے۔ ان نظموں کے علاوہ اس حصہ میں نواب فصاحت جنگ جلیل کی غزل، سکندر علی وجد کی نظم، ماہر القادری کی عقیدت کے پھول، اور جذبی علیگ کا کلام شامل ہے۔

امید ہے کہ ناظرین ان مضامین سے بہت لطف اندوز ہوں گے۔

ادارہ اشاعت اردو کی نئی کتابیں!

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
(۱)	روح اقبال	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	صہ ۱۲ر
(۲)	فکر اقبال	غلام دستگیر رشید ایم اے	للعہ
(۳)	آثار اقبال	″ ″	ہے ۱۲ر
(۴)	فلسفۂ عجم	علامہ اقبال	ہے ۴ر
(۵)	نگارشات محمد علی مرحوم	رئیس احمد جعفری	ہے ۱۲ر
(۶)	افادات محمد علی مرحوم	″ ″	ہے ۱۲ر
(۷)	تنقیدی حاشیے	سید احتشام حسین	ہے ۱۲ر
(۸)	داستان اردو	نصیر حسین خیال	عہ ۱۲ر
(۹)	ذکر جمیل	ماہر القادری	عہ ۱۲ر
(۱۰)	وسوسے	فضل حق قریشی	عا ۱۲ر
(۱۱)	سرنوشت	مجنوں گورکھپوری	عا ۱۲ر
(۱۲)	صید زبوں	″	عا
(۱۳)	سراب	″	ہے ۶ر
(۱۴)	نگینے	مظفر حسین شمیم	عا ۱۲ر
(۱۵)	تعبیریں	محمد امین شرقپوری	عا ۱۴ر
(۱۶)	اسرار	علی اختر	عا ۱۲ر
(۱۷)	دھوپ	قیسی رام پوری	ہے ۴ر
(۱۸)	ترقی پسند ادب	عزیز احمد	عا ۱۲ر
(۱۹)	مکالمات ابوالکلام	عقیل احمد جعفری	ہے ۸ر
(۲۰)	سزا	قیسی رام پوری	ہے
(۲۱)	خطا	″ ″	ہے ۸ر
(۲۲)	غبار	″ ″	ہے
(۲۳)	ہچکیاں	صدیقہ بیگم سیوہاروی	ہے ۴ر
(۲۴)	محسوسات ماہر	ماہر القادری	عا ۱۲ر
(۲۵)	نغمات ماہر	″ ″	ہے
(۲۶)	اسلامی تہذیب کیا ہے؟	غلام دستگیر رشید	عا ۸ر
(۲۷)	ناسیت	شاہد حسین رزاقی	عا ۱۲ر
(۲۸)	میخانہ ریاض	تسنیم مینائی	ہے ۴ر
(۲۹)	نفسیات زندگی	شیر محمد اختر	عہ ۱۲ر
(۳۰)	بچوں کی نفسیات	″ ″	عہ ۱۲ر
(۳۱)	زلزلے	قدوس صہبائی	عا ۱۲ر
(۳۱)	کروٹیں	″ ″	عا ۱۲ر
(۳۲)	یقین وعمل	عبدالقدوس ہاشمی	عا ۸ر
(۳۳)	ادب اور انقلاب	ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری	ہے ۸ر
(۳۴)	قصص ومسائل	مولانا عبدالماجد دریابادی	عہ ۱۲ر
(۳۵)	کاروان علم	فیض محمد صدیقی	ہے
(۳۶)	مقالات محمد علی حصہ اول	رئیس احمد جعفری	ہے ۱۲ر
(۳۷)	مقالات محمد علی حصہ دوم	″ ″	ہے ۱۲ر

لالۂ صحرا

از علامہ اقبال

یہ گنبدِ مینائی! یہ عالمِ تنہائی!
مجکو تو ڈراتی ہی اِس دشت کی پہنائی
بھٹکا ہوا راہی میں، بھٹکا ہوا راہی تو
منزل ہی کہاں تیری اے لالۂ صحرائی؟
خالی ہی کلیموں سے یہ کوہ و کمر ورنہ
تو شعلۂ سینائی! میں شعلۂ سینائی!
تو شاخ سے کیوں پھوٹا میں شاخ سی کیوں ٹوٹا
اِک جذبۂ پیدائی! اِک لذتِ یکتائی!
غواصِ محبت کا اللہ نگہباں ہو
ہر قطرۂ دریا میں دریا کی ہے گہرائی!
اُس موج کے ماتم میں روتی ہی بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سی نہ ٹکرائی!
ہی گرمیٔ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سورج بھی تماشائی تارے بھی تماشائی!

اے بادِ بیابانی مجکو بھی عنایت ہو
خاموشی و دل سوزی سرمستی و رعنائی

تسنیم سلیم چھتاری

"فریب مسلسل"

" چھیڑ دینا اپنی محفل میں ہماری داستاں
صرف اتنا دیکھ لینا اشک بھر لاتا ہے کون"
(بہزاد)

جب بنیاد رکھی گئی شاید اس نے تب ہی سوچ لیا تھا کہ یا تو بہت عالیشان بناؤں گا یا پھر اپنے ہاتھوں ہی مسمار کر دوں گا...... وہ اس دنیا میں زندگی کا بہت اعلیٰ مقصد لے کر آیا تھا وہ کھلونا نہیں کھلاڑی بننا چاہتا تھا...... جوانی کے لئے وہ بچپن ہی سے خیالات کے محل بنا رہا تھا...... اور بہت سی انہونی باتیں سوچتے سوچتے وہ جوانی کی حدود میں داخل ہو گیا۔

اب بی۔ اے ہو گیا تو کوئی بزنس شروع کر دونگا۔ ...... ایک موڈرن اسٹائل کا مکان بہترین فرش کیا ہوا...... معاً اسے اپنے ڈرائنگ روم میں ایجنتا کی تمام سنگ تراشیاں نظر آتیں...... سوچتا کہ گرمیوں میں کسی سرد جگہ چلا جایا کرونگا کشمیر کی گلپوش وادیاں اور نینی تال کے نشیب و فراز سب میرے منتظر رہا کریں گے...... کالج سے گھر تک کی لمبی سڑک پر تانگے کے جھٹکے اور سائیکل کی گھنٹی اس کی ہم آہنگی کرتی اور خیالات کے ہجوم میں اسے اپنے دوش بدوش ایک عورت بھی نظر آتی شعر کی طرح لطیف اور گیت کی طرح نازک...... اور ہاں دور بہت دور دھندلکے میں ننھے بچے...... مسرت سے اس کی ٹانگیں کانپنے لگتیں اور سائیکل بے قابو ہو جاتی۔

مفلس انسان کے خیالات باغیانہ ہوں تو بہت شکل پیش آتی ہے یہی اس کے ساتھ بھی ہوا نوکری تو غلامی ہے اور خوشامد کرنا ذلت...... زندگی کی بوجھل گاڑی دنیا کے خاردار راستوں میں کس طرح گھسیٹی جاتی...... بی اے بھی ہو چکا مگر اب کیا کرے بیکار بیٹھ رہا......

خودداری اچھی چیز ہے مگر نادار انسان کا اس سے کیا جوڑ وہ احسان مند نہیں محسن بننا چاہتا تھا اور یہی چیز اس کے اور دولت کے درمیان میں حائل تھی۔

وقت گزرتا گیا مگر اس کے خواب حقیقت نہ بن سکے...... ہر دفعہ اپنا عہد یاد آتا "حسب دلخواہ نہ جی سکا تو زندگی کا یہ تار ایک ہی جھٹکے سے توڑ دونگا" اور اس تار سے تو اور زندگیاں وابستہ تھیں معصوم بہن اور بڈھے ماں باپ! انسان تو وہ ایک ہی تھا جس کا فرض تھا کہ اپنی انسانیت کا خون بہا کر اپنے احساس کا گلا گھونٹ کر اسی طرح ناکام اور نامراد جیتا رہے۔

بہن کی شادی ہوئی اس کے دل میں کیا کیا ارمان نہ تھے مگر آنسوؤں سے بھیگی ہوئی دعاؤں کے سوا کچھ نہ دے سکا...... یہی اس کی زیست کا سرمایہ تھا بیٹی کے جانے سے ماں کی اداسی اور بھی بڑھ گئی اور ایک دن! "جب تم چھوٹے تھے تو میں تمہارے متعلق بہت کچھ سوچا کرتی تھی؟" "تو کیا اب آپ میرے متعلق کچھ نہیں سوچتیں......"

" جو کچھ آج تک سوچا تھا وہی پورا نہ ہوا...... صرف سوچنے سے تو دل مطمئن نہیں ہوتا...... کیا کیا اُمنگیں تھیں میرے دل میں!"

اُمیدیں ناکامی کے اندھیرے میں سو جائیں تو کتنا دکھ ہوتا ہے...... وہ کانپ گیا......

" آپ یہی چاہتی ہیں نا...... کہ میں نوکری کروں"

"تم بلا سے نوکری نہ کرو...... بیٹے پیدا ہوتے ہیں تو

مائیں سوچا کرتی ہیں کہ ان کے دم سے گھر آباد ہوگا ... ان سے اپنا نام چلے گا ... میرا تو بیٹا بھی صرف ایک ہے ......"

"ماں ... یہ کیا کہہ رہی ہیں ... ایک اور زنجیر ...."

"زنجیر ...... ہاں زنجیر ہی سہی مگر تم نہیں جانتے یہ ان کی خواہش ہے جو بہت جلد تمہارے پیروں سے اپنی زنجیریں کاٹ دیں گے تمہارے بڈھے باپ کی کتنی تمنا ہے کہ وہ تمہاری بہو دیکھیں ...... ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد ہم تم سے کچھ اور فرمائش کرنے کو نہ رہیں"

باپ کو خوش اور ماں کو مطمئن کرنے کے لئے ...... اس نے ہنسکر ہنسکر اپنے کو پابند سلاسل کیا .... دل رو رہا تھا کیا یہی ہے اس کے خواب کی تعبیر!!

شادی کی رات وہ بہت افسردہ تھا .....

اس نے دیکھا کہ رضیہ کی آنکھوں نے ابھی صرف خوشی کے آنسو چھلکائے ہیں ...... کیا اسے بھی میرے ساتھ اپنی تباہ حالی پر نوحہ کناں ہوتا ہے۔ رضیہ اس کے بازوؤں کی طاقت اور سینے کی چوڑائی دیکھ کر مسرور تھی اسے معلوم نہ تھا کہ اس کے چہرے سے گھونگٹ اٹھاتے وقت یہ ہاتھ کس طرح کانپے تھے اور اس کا معصوم چہرہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بہت سی نامکمل انگڑائیاں پاکر اس چوڑے سینے میں دل کس طرح چور چور ہو گیا تھا ......"

ماں اور باپ دونوں اولاد دیکھنے کی تمنا لے کر اس کا ساتھ چھوڑ گئے ...... وہ اب بھی نہ مر سکا ... رضیہ نے کیا گناہ کیا ہے ...... اسے جینا ہی پڑا۔

"رضیہ میں کتنا بدنصیب ہوں .... تمہارے لئے کچھ بھی نہیں کر سکا"

"مجھے کیا چاہیئے"

"سچ کہہ رہی ہو تمہیں کچھ نہیں چاہیئے شوہر کی بے رحم ہستی کے سوا تمہیں کسی چیز کی خواہش نہیں ...... میں نے اپنے آنسوؤں سے اپنی آہوں سے تمہاری ہر تمنا کو پورا کر دیا ہے ...."

"اور تم کر بھی کیا سکتے ہو ...."

"میں ... نہیں نہیں ابھی کچھ نہیں بگڑا ...... ابھی سب کچھ میرے اختیار میں تمہاری اور اپنی تکلیف کا ازالہ کر سکتا ہوں ......"

رضیہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "کیا مطلب"

"رضیہ" اس کی آواز بھرا گئی "مجھے آج تک اپنی مرضی کے خلاف جینا پڑا ہے ..... کم از کم خواہش کے مطابق موت تو نصیب ہو جائے ...... تمہیں اپنے سینکڑوں قدردان مل جائیں گے تم اپنی زندگی کامراں بنالو میری روح ہمیشہ مطمئن رہیگی"

"تم کتنے سنگدل ہو"

"پھر کیا کریں"

"کیا اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ...... تم تنہا نہیں مر سکتے تمہارے ہاتھوں ایک اور خون ہوگا . شاید دو ...."

جس پر مسرت خیال سے سائیکل پر اس کی ٹانگیں کانپ جاتی تھیں اس کی حقیقت محسوس کر کے اس کا سر چکرا گیا۔

"میں باپ بننے والا ہوں" کسی نے اس کے کانوں میں چیخ چیخ کر کہنا شروع کر دیا "پاؤں کی بیڑیاں بڑھ رہی ہیں تو اب نہیں مر سکتا تجھے اسی طرح جینا ہوگا .... تجھے اب کچھ کرنا بھی پڑے گا ...... اس بدنصیب بچے کا مستقبل سنبھالنے کے لئے"

ماں باپ کی موت نے اسے بہت بزدل کر دیا تھا وہ ہمیشہ سے رونے کا عادی تھا جب تک ماں زندہ تھی وہ

دل پھر نیا زخم لگ جانے کے بعد اسی کی گود میں سر رکھ کر رویا کرتا تھا اور ماں کی موت کے بعد وہ رضیہ کے سامنے رونے لگا تھا۔ کیا اب وہ اس بچے کے سامنے بھی رویا کرے گا........ وہ کبھی نہیں ہنستا تھا مگر اب ہنسا کرے گا۔ وہ اپنے بچے کے لئے کہیں سے ہنسی لائے گا ایسی ہنسی جو زندگی کے سارے غم بہلا دے۔ وہ بچے کی زندگی سے تمام آنسو نچوڑ کر پھینک دے گا...... مگر یہ بچہ اسے کیا حق تھا اس دنیا میں آنے کا کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ بچہ پیدا ہی نہ ہو......... میں اسے ورثہ میں آنسوؤں کے سوا اور کیا دے سکونگا؟" پھر اسے رضیہ کا خیال آیا شادی کے شروع دنوں میں وہ کتنی خوش رہتی تھی اور اب ہر وقت مغموم اداس اور کھوئی کھوئی.... کیا پتہ یہ بچہ رضیہ کو اس کی گمشدہ مسرت واپس دلا دے ....." مجھے کچھ کرنا ہی پڑے گا"......

وہ ساری باتیں جو آج تک محض سوچی گئی تھیں اب کی جانے لگیں وہ سارے ارمان جو دل میں گھٹ گھٹ کر رہ رہے تھے اب منظرِ عام پہ لائے گئے...... اس نے افسانہ نگار بن کر اپنی خواہشوں کی نمائش شروع کر دی وہ خود کبھی گرمیوں میں بجلی کا پنکھا بھی نہ چلا سکا مگر اس کے ہیرو گرمیاں گزارنے شملہ اور مسوری جاتے بعض اوقات اسے تانگہ کا کرایہ بھی گراں گزرتا اور اس کے افسانوں کے کردار موٹروں اور ہوائی جہازوں میں اڑے پھرتے ...... وہ خود بھی اپنے افسانوں میں غرق ہو کر اپنے کو بھول جاتا اور یوں اسے ذہنی سکون اور پیسہ دونوں مل رہے تھے۔

ڈاکٹر نے کہا "مبارک ہو لڑکا"......

بچہ بالکل ماں کی صورت تھا..... آج بہت دنوں بعد رضیہ کے چہرے پہ وہی دلکش مسکراہٹ نظر آتی جس کا اب ہلکا سا نشان بھی نہ بچا تھا۔

اس کے افسانے بہت مقبول ہو رہے تھے اور جب سے بچہ پیدا ہوا اس نے کام بھی بڑھا لیا تھا...... رات کے دو دو بج جاتے اور وہ میز پہ جھکا ہوا لکھتا رہتا رضیہ کہتی۔

"بس اب اٹھیئے صبح کو لکھیئے گا"

"ہاں بس ایک ذرا اور......" اور اس کا سر میز پر اور بھی جھک جاتا۔

دن رات کی محنت نے صحت کا ستیاناس کر دیا روز سر میں درد ہونے لگا کبھی کبھی حرارت بھی ہو جاتی ڈاکٹر نے کہا دو مہینے کے لئے کسی سرد مقام پہ چلے جاؤ رضیہ نے کہا "ضرور چلیں گے" وہ محض ہنسکر رہ گیا۔

بچہ دو سال کا ہو گیا تھا........ دونوں دن رات بیٹھ کر اسی کے متعلق باتیں کیا کرتے....... جب کوئی نیا افسانہ مکمل ہو جاتا تو وہ اطمینان سے مضمحل جسم کو بستر پہ گرا کر رضیہ سے بچے کے متعلق پوچھتا۔

"کیوں رضیہ تمہارا کیا خیال ہے ہمارا بچہ بڑا ہو کر کیسا انسان بنے گا۔

"بالکل تمہاری طرح" رضیہ مذاق سے کہتی۔

"خدا نہ کرے .... میرا اس پر اثر نہ پڑے........ میں بہت بدنصیب ہوں.... ..... یہ تو......" اور پھر نہ جانے وہ کیا کیا باتیں سوچنے لگتا

بچے کو ٹھنڈ ہو گئی اسے خود کو بھی بخار رہتا مگر ساری رات پٹی سے لگا رہا .... بچے کو نمونیا ہو گیا اور تین دن تک دونوں ایک مسلسل کرب میں مبتلا رہے آخر چوتھے دن اس کا ننھا بچہ رضیہ کی گود سے چھن کر موت کی سرد اور منوم آغوش میں چلا گیا......... اس نے لرزتے ہاتھوں سے بچہ کو اٹھا لیا اور گھر سے باہر نکل آیا۔

"دیکھو میرے بچے کو کیا ہو گیا یہ ہنستا کیوں نہیں

یہ بولتا کیوں نہیں یہ ٹھنڈا کیوں ہو گیا ہے یہ جاگتا کیوں نہیں" جب بچے کو زبردستی اس سے لے لیا گیا تو اس نے بیہوش رضیہ کو جھنجوڑنا شروع کیا " تم کہتی تھیں کہ یہ بے چین ہے اسے نیند نہیں آتی .... دیکھو یہ کیسا بے خبر سو رہا ہے اب تو اسے بخار بھی نہیں ....."

حواس درست ہوئے تو سرشت ہی بدل چکی تھی ..... ہنسنا بھول گیا تھا رونے کے لئے اب آنکھوں میں آنسو بھی نہ بچے تھے .... شراب کی سیاہ بوتلیں اور زردی و سفیدی کا مجسمہ رضیہ دونوں اس کے غم کو اس سے نہ چھڑا سکے صدمے اور شراب نے اس کی رہی سہی صحت بھی برباد کر دی۔ سینے میں درد رہنے لگا۔

ڈاکٹر نے کہا " پھیپھڑے خراب ہو رہے ہیں۔ علاج ہونا چاہیئے چھ مہینے بالکل آرام کرو"

اس نے فیس میز پر رکھی اور خالی جیب ہلاتا ہوا گھر آ گیا۔

" رضیہ مجھ سے ان بڑے شہروں میں نہیں رہا جاتا جہاں تہذیب کا دیا انسانیت کے روغن سے جلایا جاتا ہے۔

" کیا ہوا" رضیہ نے پرنم آنکھیں اٹھائیں"

"کب تک کہوں کر کیا ہوا زندگی صرف زخموں اور اس کے اندمال ہی کا نام نہیں زندگی صرف آہوں اور سسکیوں ہی کا مجموعہ نہیں آنکھیں صرف رونے کے لئے ہی نہیں بنائی گئیں میں ہنسنا بھی چاہتا ہوں مجھے خوش رہنے کی بھی تمنا ہے ...."

" پھر کیا کریں"

" کچھ نہیں اپنے کو فریب دیتا آیا ہوں اور دیتا رہونگا"

اس نے قلم اٹھایا اور لکھنے لگا برابر کے مکان میں ریڈیو بج رہا تھا۔

" یہ زندگی فریب مسلسل نہ ہو کہیں
شاید اسیر دام بلا ہو گیا ہوں میں

غزل

نواب فصاحت جنگ جلیل

جنکے جلوے یہ سرِ طور نظر آتے ہیں
دِل کے پردے میں وہ مستور نظر آتے ہیں

کھینچدی خُلد کی تصویر بہارِ گُل نے
پھُول جتنے ہیں رُخِ حور نظر آتے ہیں

کس کا میں دیکھنے والا ہوں نہ پوچھو یہ کلیمؑ
اِک نظر میں مجھے سو طور نظر آتے ہیں

تھک گیا قافلہ زیست بھی چلتے چلتے
ابھی منزل کے نشاں دور نظر آتے ہیں

ہر نظر اسکی جھلکتا ہوا ساغر ہے جلیلؔ
آج ہم پینے پہ مجبور نظر آتے ہیں

مجنون
گورکھپوری

حضرت آسی کا تغزل

اس قدر درد سے لبریز جو تقریر نہ ہو
سخنِ آسیِ شیدا غزلِ میر نہ ہو

میرے مقالہ کا موضوع حضرت آسی غازی پوری کی شاعری اور انکا وہ نرالا انداز تغزل ہے جس کی بنا پر خود شاعر کو احساس ہے کہ اس کی شاعری اکثر "غزل میر" کے رتبہ کو پہنچ جاتی ہے جیسا کہ اس نے اپنے شعر میں ظاہر کر دیا ہے۔

دنیا میں محرومی دو طرح کی ہوتی ہے ایک تو یہ کہ جس چیز کو چاہو وہ نہ ملے۔ دوسری یہ کہ ایک ملی ہوئی دولت کی صحیح اور کما حقہٗ قدر نہ کی جائے۔ اگر ایک طرف ایسوں کی تعداد بے شمار ہے جو عمر بھر اکسیر کی تلاش کرتے رہے اور نہ پا سکے تو دوسری طرف ایسوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں جن کو اکسیر ملنے کو تو بارہا ملی مگر وہ بیشتر اوقات اس کو خاک سمجھتے رہے۔ میں جب آسی غازی پوری کی شاعری پر غور کرتا ہوں اور پھر اس ناشناسی اور بیگانہ وشی کو دیکھتا ہوں جس کو اردو شاعری کے نقادوں نے ان کے حق میں برتا ہے تو مجھے اس دوسرے ہی قسم کی محرومی کی مثال نظر آتی ہے۔

آج مجھے کوئی قابل قدر تاریخ شعر اردو ایسی یاد نہیں آتی جس میں آسی کی شاعری کا اعتراف کیا گیا ہو مولانا عبد السلام ندوی جیسا بالغ نظر اور ہمہ گیر مورخ دو جلدیں "شعر الہند" کی لکھ ڈالتا ہے اور مشکل سے کسی ایک جگہ آسی کا نام لیکر چپ ہو جاتا ہے اور پھر نہ ان کی شاعری پر کوئی رائے دیتا ہے اور نہ ان کا ایک شعر درج کرتا ہے۔ کیا آسی کے سارے کلام میں ایک شعر بھی ایسا نہ نکل سکا جس کو تغزل یا تصوف یا کسی اور عنوان کے ماتحت مثالاً پیش کیا جا سکتا؟ کہا جا سکتا ہے کہ آسی کا مرتبہ شاعر سے بہت بلند تھا اور شاعری ان کے لئے باعث فخر نہ تھی۔ وہ خانقاہ رشیدیہ کے سجادہ نشین تھے اور ایک صاحب باطن مرشد اور یہی انکی اصل بزرگی اور برگزیدگی ہے جس کے سامنے ان کی ساری شاعری شرما کر منہ چھپا لیتی ہے یہ آسی خود کہتے تو ہم خاموش ہو جاتے یا پھر اگر کوئی ان کا ایسا مرید کہتا جو شاعری کا مبصر نہ ہوتا یا کم از کم شاعری پر تنقید کرنے نہ بیٹھا ہوتا تو بھی اس کو معاف کیا جا سکتا تھا لیکن ایک نقاد ادب کو ایسا تجاہل زیبا نہیں۔ اردو شاعری میں آسی کی شاعری کو شامل نہ کرنا صریح ظلم ہے۔ مانا کہ آسی کے لئے شاعری ننگ تھی لیکن ہمارے لئے تو ننگ نہیں ہے اور پھر آسی کے کلام میں جو سنجیدہ دردمندی اور جو متین گدازی ہے وہ صاف اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خود بھی مزہ لے کر شعر کہتے تھے اور شاعری کو ننگ و عار کی چیز نہیں سمجھتے تھے۔

سب سے پہلے ان کی مشہور غزل کے دو شعر لیتا ہوں اور انھیں سے اس تبصرہ کا افتتاح کرتا ہوں۔ مطلع ہے:۔

وصل ہے پر دل میں اب تک ذوقِ غم پیچیدہ ہے
بلبلہ ہے عین دریا میں مگر نم دیدہ ہے

یہ شعر اگر سوچئے تو شعورِ محبت کی ایک خاص منزل کا پتہ دیتا ہے جو تصوف کے انفعالی سکون سے اتنا ہی دور ہے جتنا کہ نفسانیت کے اضطراری ہیجان سے۔ شاعر کو وصل اس وقت میسر ہوتا ہے جبکہ وہ ایک پوری عمر وصل کی تمنا میں کھو چکا ہے اور اس کی ایک خاص طبیعت بن چکی ہے۔ ہجوری کا غم سہتے سہتے اس کے اندر ایک ذوقِ غم پیدا ہو گیا ہے یعنی اب غم اس کا مزاج ہے اور اب اس کو وصل نصیب ہوتا ہے جبکہ وہ وصل سے لذت اندوز ہونے کی پوری صلاحیت نہیں رکھتا۔ نتیجہ ایک عبرتناک کش مکش Comflict ہے جس کو ہر کس و ناکس نہیں سمجھ سکتا۔ ایک طرف تو وصل کی نشاط انگیزیاں ہیں دوسری طرف اس ذوقِ غم کا جواب بمنزلۂ فطرت ہے مطالبہ یہ ہے کہ کسی چیز سے نشاط نہ حاصل کرو اس کش مکش کو شاعر صرف لفظ 'پیچیدہ' سے ادا کرتا ہے اب آپ اس لفظ کی بلاغت کا اندازہ کیجئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے لکھنؤ کے ایک دوست نے جو اردو تنقید نگاری میں کافی روشناس ہو چکے ہیں ایک مرتبہ اسی شعر کو پڑھ کر اعتراض کے لہجہ میں پوچھا تھا 'آخر اس ذوق پیچیدہ کے کیا معنے ہیں' میں نے ان کو بہت سمجھانے کی کوشش کی تھی کہہ نہیں سکتا کہ وہ سمجھ سکے یا نہیں مگر چپ ضرور ہو گئے۔ خیر اب دوسرے مصرع کی طرف آیئے۔

تشبیہات اور استعارات کی دنیا کا پورا جائزہ لے چکنے کے بعد بھی اس خاص حالت کی مصوری کے لئے اس سے زیادہ صحیح تشبیہہ خیال میں نہیں آتی۔ تشبیہ یا استعارہ جب تک جامع اور مانع نہ ہو فنی اعتبار سے ہم اس کو مکمل نہیں کہہ سکتے۔ یہ بلبلہ کی تشبیہہ جس طرح ہماری اس مخصوص حالت پر محیط ہو گئی ہے شاید کوئی دوسری تشبیہ نہ ہو سکتی۔

یہ کش مکش کوئی ایسی دنیا سے نرالی بات نہیں جو ہماری سمجھ میں نہ آئے۔ لیکن عام انسان یا تو اس منزل تک پہنچنے کی تاب نہیں لاتا یا اگر پہنچ جاتا ہے تو عموماً اپنی حالت سے بے خبر رہتا ہے۔ شاعر کا کام ہمارے اندر آگاہی پیدا کرنا ہے۔ شاعر اور صوفی میں سب سے بڑا فرق یہی ہے۔ صوفی کے لئے اس کے اپنے واردات اور تجربات ہی سب کچھ ہوتے ہیں اور وہ انھیں میں کھویا رہتا ہے۔ برخلاف اس کے شاعر اپنے واردات اور تجربات کو اس وقت تک قابل قدر نہیں سمجھتا جب تک کہ وہ ان کو از سرِ نو پیدا کر کے دوسروں کے مطلب کی چیز نہ بنا دے۔ صوفی جب خبردار ہوتا ہے تو پھر ہم کو خود اس کی خبر نہیں لگتی۔ شاعر جب خبردار ہوتا ہے تو وہ دوسروں کو بھی خبردار کرنے کے لئے بیتاب رہتا ہے آسی کے شعر کا یہی اثر ہوتا ہے کہ ہم خود اپنی واقعی یا امکانی حالت سے آگاہ ہو کر اس پر عبور پا جاتے ہیں۔

میں نے سب سے پہلے اس شعر کو اس لئے منتخب کیا کہ اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خود شاعر کس منزل پر ہے۔ یہ وہ منزل ہے جہاں نہ محض صوفی پہنچ سکتا ہے نہ محض شاعر بلکہ صرف وہ شخص پہنچ سکتا ہے جو صوفی اور شاعر دونوں ہو اور جس نے تصوف اور شاعری کو ملا کر ایک آہنگ بنا لیا ہو۔ آسی مجھے مجاز اور حقیقت کا ایک نہایت خوشگوار تصفیہ معلوم ہوتے ہیں ان کی شاعری اس سطح سے ہوتی ہے جہاں مجاز حقیقت اور حقیقت مجاز ہے۔ خود شاعر اپنے اندر اس کا احساس پاتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے۔

؎ دنیا میں اٹھا لائیگی فردوسِ بریں کو
بدمستی صہبا و مزا میرِ ہماری

یہی وجہ ہے کہ آسی کے حال میں قال کا مزہ ہوتا ہے اور ان کے قال میں حال کا کیف ان کی

شاعری کی ایک عام خصوصیت یہ ہے کہ ان کے اشعار کو ہر سطح کا آدمی حسب توفیق دلنشین پاتا ہے اور ان سے کیف اندوز ہوتا ہے مثال کے طور پر اب وہ دوسرا شعر لیجئے جو اسی غزل کا مقطع ہے جس کے پہلے شعر سے میں نے ابتداء کی تھی۔

ع　حشر میں منہ پھیر کر کہنا کسی کا ہائے ہائے
آسیؔ گستاخ کا ہر جرم نابخشیدہ ہے

مجاز میں حقیقت کو دیکھنا ایک بہت پرانی سی رسم ہو گئی ہے۔ یہ کہنے والے دنیا میں بہت ملیں گے۔

ع　مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بتخانہ تھا
ہم سبھی مہمان تھے اِک تو ہی صاحب خانہ تھا

لیکن حقیقت کو مجاز کی نت نئی رنگینیوں سے معمور اور پر کیف پانے کے لئے ایک خاص بصیرت درکار ہے مجاز میں حقیقت کا نظر آنا تو پھر بھی دونوں میں ایک محسوس فرق کو باقی رکھتا ہے لیکن حقیقت میں مجاز دیکھنا دراصل دونوں کو ایک محسوس کرنا ہے۔ آسیؔ نے اپنے شعر میں یہی کیا ہے۔ پڑھتے ہی ہر مدرس کہدے گا کہ شعر میں حشر۔ داور حشر اور اپنی گنہگاریوں کا ایک مرقع پیش کیا گیا ہے۔ لیکن شعر کو جو چیز اسی قبیل کے اور سیکڑوں اشعار سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کی بلیغ مجازیت Symbolism یا تمثیلیت Allegorsm ہے اور اسی نے اس کو ہر شخص کے حالات اور جذبات سے قریب اور مانوس رکھا ہے شاعر نے عارفانہ وجدانات کو عاشقانہ واردات بنا دیا ہے اور اس کو اپنی اپنی توفیق اور اپنی بصیرت پر چھوڑ دیا ہے کہ داور حشر کو جو جی چاہے سمجھ لو۔ ہمارے لئے اس کی بھی پوری گنجائش کہ ہم اس ہستی کو جزا اور سزا کا مالک سمجھیں جو اس زندگی میں ہمارے دل کا مدعا رہ چکی ہو اور جس نے اس دنیا میں ہماری تمناء کی گستاخیوں اور بیباکیوں کو کبھی نہ بخشا ہے۔ ریاضؔ مرحوم کا ایک شعر ہے۔

ع　رہا ہے جو اس دل میں ہنگامہ آرا
وہی جلوہ آرائے محشر نہ نکلے

ریاضؔ کے تخیل میں جو بات گمان و تذبذب رہ گئی تھی وہ آسیؔ کے مشاہدہ میں آگئی ہے اور عین الیقین ہو گئی ہے۔ داور حشر سے ہم کوئی اجنبیت نہیں محسوس کرتے اس لئے کہ وہ تو ہمارا وہی قدیم محبوب ہے جو اپنی تمام بے وفائیوں کے باوجود زندگی میں ہمارے سارے حرکات و سکنات کا کارفرما رہ چکا ہے اگر آسیؔ فطرتاً شاعر نہ ہوتے اگر وہ محض ایک عارف کامل ہوتے تو ایک ایسے تصور مجرد کی اتنی کامیاب مصوری نہ کر سکتے کہ ہر شخص کو وہ ایک ایسا امکان معلوم ہونے لگے جس کو واقعہ کی صورت اختیار کرتے دیر نہیں لگتی۔

اسی غزل کے بعض اور اشعار سننے کے لائق ہیں۔

ع　آنکھیں تجھ کو ڈھونڈھتی ہیں دل ترا گرویدہ ہے،
جلوہ تیرا دید ہے صورت تیری نادیدہ ہے

انگریزی کے مشہور نقاد ہیزلٹ Hazlitt نے سچ کہا ہے کہ شاعری تخیل اور جذبات کی زبان ہوتی ہے۔" اور میرا خیال ہے کہ اگر منطق یا ریاضیات کو بھی اس زبان میں پیش کیا جائے تو وہ شاعری ہو جائے شاعری اور منطق میں سوا اس کے اور کوئی فرق نہیں کہ منطق کی زبان اور اس کے تصورات جذبات و تخیل سے ایک قلم عاری ہوتے ہیں۔ بہرکیف ذرا آسیؔ کے اس "تجھکو" کو ملاحظہ کیجئے جس کو ان کی آنکھیں ڈھونڈھتی رہتی ہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ صوفیوں کا وہی پرانا رسمی معشوق ہوگا جس کو شاہد ازل کہتے ہیں۔ لیکن آسیؔ کے انداز تخاطب میں جو بے تکلفی جو والہانہ سادگی اور جو عاشقانہ وارفتگی پائی جاتی ہے اس نے اِس شاہد ازل کو ہر شخص کا محبوب بنا دیا ہے اور ہم آپ سب محسوس کرنے لگے ہیں کہ ہماری

زندگی میں ایسے تخاطب اور تکلم کا موقع بارہا آچکا ہے۔

دوسرا شعر خالص تصوف اور معرفت کا ہے لیکن اس میں بھی مجاز کی پوری رنگینیاں موجود ہیں اور اس بت پرستی کی لاج رکھ لی گئی ہے جو انسان کی فطرت اصلی ہے۔

۵۔ اتنے بتخانوں میں سجدے ایک کعبہ کی عوض
کفر تو اسلام سے بڑھکر تیرا گرویدہ ہے

یہ اس غزل کے اشعار تھے جس سے ہر وہ شخص واقف ہے جو اردو شاعری کا صحیح مذاق رکھتا ہے۔

اب قبل اس کے کہ ہم آسی کے اور اشعار کی طرف متوجہ ہوں ان کے متعلق چند اہم رسمی باتوں کا ذکر بھی ضروری ہے۔

آسی کا سلسلۂ تلمذ ناسخ سے ملتا ہے اور جہاں تک شاعری کے اسالیب و صور کا تعلق ہے وہ لکھنوی دبستان کے تربیت یافتہ ہیں چنانچہ ان کے دیوان میں ایسے اشعار بھی ہیں جن کو آج کل کے روشن خیال نقاد محض اردو شاعری کے مزخرفات کہکر الگ کر دیں گے اور جن میں سوائے مناسبات و رعایات کے اور کچھ نہیں ہے۔ اور اس سے انکار نہیں کہ یہ اشعار صرف زمین اور ردیف و قافیہ بنانے کے لئے کہے گئے ہیں۔ یہ اشعار کچھ شاہ نصیر۔ ذوق۔ ناسخ اور رشک ہی کو زیب دے سکتے تھے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:۔

کہا یہ دیکھ کر خال بت بے پیر کا دانہ
آلٰہی اس کو تو کرنا مری تقدیر کا دانہ
جو دانا ہے تو دیوانوں کے قدموں ہی کو لیتا ہے
مسلسل یہ صدا دیتا ہے ہر زنجیر کا دانہ

گلوئے خشک خواہاں ہر دم تکبیر پانی کا
ذبیحہ سے نہ کر بخل اے دم شمشیر پانی کا
خدنگ آہ نکلا یا کلیجہ ہو گیا پانی
ہوائی تیر سنتے تھے یہ دیکھا تیر پانی کا

آہ بھی آج ہوئی ہم سفر اشک نئی
کیا ملی سوئے فلک رہگذر اشک نئی
آج تو گریۂ عاشق نے کئے دل ٹکڑے
ہاتھ آئے کوئی تیغ اثر اشک نئی
کوشش دست مژہ نے اسے کب روکا تھا
آج ہے طرز گرفت کمر اشک نئی

اس انداز کے اشعار دیوان آسی میں کم نہیں ہیں مگر یہ ان کی شاعری نہیں ہے بلکہ صرف مشق و ریاضت ہے۔ جس طرح وہ خانقاہ رشیدیہ کی سجادہ نشینی اور اس کے تمام رسوم و روایات کی پابندی کو اپنی روح کی تہذیب و تحسین کے لئے ضروری سمجھتے تھے اسی طرح انھوں نے اپنے مدرسۂ شاعری کے تمام شرائط و لوازم کو پورا کرنا شاعری کی تکمیل کے لئے اپنا نصاب بنالیا تھا۔ آسی کے مریدین اُن اشعار کو جو ابھی سنائے گئے ہیں آسی کی ابتدائی مشق بتاتے ہیں اور یہ بہت بڑی حد تک صحیح ہے لیکن ان اشعار کی حقیقت صرف اسی قدر نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ دراصل ان بندشوں اور ضابطوں کی یادگار ہیں جس سے آسی نے اپنے نفس شعری کی تربیت کی ہے۔

آسی نے زبان۔ تشبیہات و استعارات اور دیگر رعایات وہی استعمال کئے ہیں جو روز اول سے ہمارے اردو شعرا استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ لیکن انھوں نے ان روایات قدیمہ میں جو نئی جان ڈالی ہے اس کی دوسری مثال مشکل سے ملے گی۔ جو تاثیر آسی نے اپنے کلام میں ان رسوم و تکلفات سے پیدا کی ہے وہ انتہائے خلوص و سادگی کے باوجود بھی کسی دوسرے کو مشکل ہی سے میسر ہو سکتی تھی۔ مجھے یہ کہنے میں مطلق تامل نہیں کہ آسی دبستان ناسخ کے پیغمبر ہیں۔ خود ان کو بھی اس کا احساس ہے مگر آخر اس تاثیر کا راز کیا ہے؟ آسی کی باتیں

اس قدر درد سے لبریز کیوں ہوتی ہیں اور وہ ہم پر چھا کیوں
جاتی ہیں؟

آسی کو یہ راز معلوم تھا کہ حقیقت کبھی عریاں منظر
عام پر نہیں لائی جا سکتی۔ حقیقت سے میری مراد محض معرفت
خداوندی نہیں ہے بلکہ ہر وہ حالت ہے جو ہم پر گزرے۔
بہرحال آسی نے تشبیہات اور استعارات اور دیگر صنائع
و بدائع سے وہی کام لیا ہے جو اہل معرفت رموز و علامات
سے لیتے ہیں۔ وہ ہر کیفیت اور ہر تاثر کو اس قدر آراستہ
و پیراستہ کر کے سامنے لاتے ہیں کہ ظاہر پرست ان کو
محض خرافات شاعری سمجھتے ہیں لیکن اہل بینش کے دل
پر بن جاتی ہے۔ اس لئے کہ وہ دیکھ لیتے ہیں کہ شاعر در اصل
کس حال میں ہے، اور اس بناؤ سنگار سے اس کا
اصل مقصد کیا ہے۔

آسی کے لئے یہ تمام رموز و کنایات۔ یہ سارے
تشبیہات و استعارات زندہ حقیقتیں ہیں۔ میں یہاں ایک
شعر سے اپنا مطلب واضح کرنا چاہتا ہوں اور وہ آسی
کے جاننے والوں میں کافی مشہور شعر ہے:-

ع تاب دیدار جو لائے مجھے وہ دل دینا
منہ قیامت میں دکھا سکنے کے قابل دینا

ایسوں کی تعداد کافی ہے جو شعر سنتے ہی یہ کہہ دینگے
"میاں اس شعر میں رکھا ہی کیا ہے۔ وہی قیامت کا ذکر
وہی تاب دیدار کا رونا۔ وہی دقیانوسیت" میں اسلئے
یہ کہنے کی جرات کر رہا ہوں کہ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں جبکہ یوم
حالی کے سلسلے میں میں پانی پت جا رہا تھا تو اپنے چند
ہم سفر احباب سے اس شعر پر اس قسم کی رائے سنی تھی۔
مجھے بھی اتفاق ہے کہ ہاں سب باتیں وہی ہیں۔ قیامت
بھی وہی۔ تاب دیدار بھی وہی۔ لیکن رہی دقیانوسیت
کہنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ شاعر اچھی طرح جانتا ہے کہ
دیدار کی تاب لانا دنیا میں سب سے زیادہ سخت اور
دشوار کام ہے۔

حضرات ذرا ہم آپ سب اپنی اپنی زندگی پر تبصرہ
کر جائیں ہم میں سے کتنے ہیں جن کو اس دیدار سے سابقہ
پڑا ہے اور جو اس کی تاب لا سکے ہیں؟ وہ قیس و فرہاد
ہوں یا کلیم و منصور اپنی تنگ ظرفی اور بے تابی کی بدولت
محبوب کے جلووں کے سامنے شرمندہ سبھی کو ہونا پڑتا ہے
یہ شرمندگی انسان کا مقدر معلوم ہوتی ہے۔ آسی کی
لغت میں قیامت نام ہے دوسرے روز دیدار کا۔ ان
کے لئے قیامت کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ محبوب
سے دوبارہ مگر آخری بار ملاقات ہوگی۔ یہ محض خیال
نہیں ہے بلکہ آسی کا ایمان ہے۔ حشر کی غایت سوائے
اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ محبوب کا دیدار نصیب ہو۔
اب ذرا سوچئے کہ ایک عاشق نامراد جو زندگی میں اپنی
تاب نظارہ سے دھوکا کھا چکا ہو اور صرف اپنے ظرف
کے بدولت جلوۂ یار سے محروم رہ گیا ہو اور جس کو ابھی یہ
اندیشہ لگا ہو کہ کہیں پھر ایسا ہی نہ ہو سوائے اس کے اور
کیا دعا مانگ سکتا ہے کہ ع

تاب دیدار جو لائے مجھے وہ دل دینا

اور یہ دعا کچھ عجیب قسم کا خلوص اپنے اندر رکھتی
ہے جس کا اثر زبان تک میں موجود ہے۔ پیرایۂ اظہار
میں جو گداختگی اور جو گھلاوٹ پائی جاتی ہے اس سے
غیر شعوری طور پر سننے والے کو اپنی گزری ہوئی حالت یاد
آ جاتی ہے اور وہ بے اختیار دعا میں آسی کا ہم آہنگ
ہو جاتا ہے۔ سنتے ہیں لب اظہار کا یہ معجزہ کبھی مسیحا کو
ملا تھا۔

آسی نے قیامت کے پامال تصور میں ایک نئی زندگی
پیدا کر دی ہے۔ ان کے دیوان میں قیامت کا بار بار
ذکر آتا ہے اور جب ذکر آتا ہے تو مخصوص تصور اور مخصوص
اعتقاد کے ساتھ۔ قیامت اس دن کا نام ہے جبکہ
اس کاروبار عاشقی کی تکمیل ہوگی جو اس زندگی میں نامکمل
رہ جاتا ہے۔ اس کو نفسیات کی اصطلاح میں ان داعیات

و ملاقات کی تکمیل کہتے ہیں جو چند در چند اسباب و عوارض کی وجہ سے ہماری روزمرہ کی زندگی میں پورے نہیں ہو پاتے ہماری اِن خوں گشتہ حسرتوں اور رد کردہ تمناؤں کی تکمیل ہمیشہ پردے میں ہوتی ہے۔ ہمارے خواب اس تکمیل آرزو کی ایک خاص صورت ہیں خواب میں ہمارا نفس آزاد و خود مختار ہوتا ہے اور محال سے محال آرزو کو آسودہ کر سکتا ہے۔ آسی قیامت اور خواب دونوں کو ایک ہی عنوان کی چیزیں سمجھتے ہیں سکتے ہیں اور کس یقین کے ساتھ کہتے ہیں:۔

ع　میری آنکھیں اور دیدار آپ کا
یا قیامت آ گئی یا خواب ہے

ایک دوسری غزل میں کہتے ہیں:۔

ع　رو کے آسی پوچھتا تھا کب قیامت آئیگی
کس طرح کہئے کہ وہ تیرا تمنائی نہ تھا

تمنا اور انتظار کا اس سے زیادہ شدید اور بلیغ ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے اور پھر قیامت کا اس سے زیادہ متعین اور واضح تصور کہاں ملیگا؟ کبھی کبھی آسی کا یقین متزلزل بھی ہو جاتا ہے اور قیامت کے دن کی کامیابی کی طرف سے بھی وہ کچھ بدگمان اور مایوس ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اس شعر میں:۔

ع　وہ کاش اتنا قیامت میں تو پوچھیں
کہاں ہے آسیٔ بیدل ہمارا

یا یہ شعر:۔

ع　وہاں بھی وعدۂ دیدار اس طرح ٹالا
کہ خاص لوگ طلب ہوں گے بار عام کے بعد

مگر اساسی تصور وہی ہے یعنی قیامت اور دیدار کے درمیان ایک ازلی نسبت ہے اور قیامت تو بہت بعد کی چیز ہے آسی اس سے ایک منزل پہلے شب گور کو بھی ملاقات کی رات سمجھتے ہیں۔

کہتے ہیں:۔

ع　اب تو پھولے نہ سمائینگے کفن میں آسی
ہے شب گور بھی اس گل کی ملاقات کی رات

موت اور بعد الموت کے متعلق آسی کے علاوہ اگر کسی کو ایسا یقین اور اطمینان نصیب تھا تو وہ سقراط ہی تھا۔ اور اگر آسی کا یہ یقین پورا نہ ہوا تو قیامت سے بھی حاصل کچھ نہیں۔

ع　نظر و ناظر و منظور نہ جب ایک ہوئے
کیا ملا روز قیامت میں ندامت کے سوا

پھر قیامت میں بھی وہی ندامت ہوگی جو ایک بار زندگی میں ہو چکی ہے۔ آسی زندگی کو ایک طویل میعاد انتظار و امید قرار دیتے ہیں جو قیامت کے دن پوری ہوگی۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

ع　کچھ ہمیں سمجھیں گے یا روز قیامت والے
جس طرح کٹتی ہے امید ملاقات کی رات

اور اس شعر میں تو نہایت لطیف اور بلیغ کنایہ میں واضح کر دیا ہے کہ بچھڑے ہوئے محبوب سے ملنا اب قیامت ہی میں ہوگا۔

ع　آنکلی آسی بیتاب کس سے چھوٹا ہے
کہ خط میں روز قیامت لکھا ہے نام کے بعد

اگر قیامت یہی ہے تو اس کو عشاق کی عید سمجھئے۔

قیامت کی اصل غایت تو جیسا کہ دکھایا جا چکا ہے یہی ہے کہ محبوب کی ملاقات میسر ہو لیکن اس کا بھی اندیشہ ہے کہ ہم مایوس و ناکام رہ جائیں۔ اور قیامت کے دن بھی کچھ نہ ہو سکے اس لئے کہ اپنے اپنے ظرف اور اپنی اپنی تاب کی شرط لگی ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ عین وقت پر ہمارا ظرف پھر ہمارے ساتھ کمی کر جائے۔ اس خیال سے آسی کا دل کانپ اٹھتا ہے۔ ایک رباعی میں کہتے ہیں۔

پھر بادۂ تند غصہ پینا ہوگا
پھر ٹکڑے جگر کے ساتھ سینا ہوگا

جینے نے یہاں کے مار ڈالا آسی
سنتے ہیں کہ پھر حشر میں جینا ہوگا

بے ساختہ اِس جگہ یقین کا ایک شعر یاد آگیا۔

دو بارہ زندگی کرنا مصیبت اس کو کہتے ہیں
پھر اٹھنا بے دماغوں کا قیامت اس کو کہتے ہیں

لیکن یقین اور آسی میں وہی فرق ہے جو شوریدگی اور پختہ مغزی میں ہوا کرتا ہے۔

بہرحال قیامت کے دن اور کچھ ہو یا نہو اتنا تو ہونا ہی ہے کہ ہماری زندگی کا تصفیہ جہاں سے چھوٹا تھا وہیں سے پھر شروع ہوگا۔

؎ خبر جو محشر میں بھیڑ کی ہے و حسرتوں کا ہجوم ہوگا
وہ داغ ہوگا کسی کے دل کا جو چمکے گا آفتاب بن کر

اور حسرتوں کا یہ ہجوم زیادہ تر ہمارے جذبۂ عشق کی نیابت کرے گا اس لئے کہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زندگی میں جو جذبہ سب سے زیادہ نامکمل اور نا آسودہ رہ جاتا ہے وہ ہمارا جذبۂ عشق ہی ہوتا ہے ہماری جو تخیل سب سے زیادہ ناقص رہ جاتی ہے وہ محبت کی تخیل ہے اور ہم مجبوراً اس کو قیامت کے دن کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔

دور جدید کی مہذب اور تعلیم یافتہ دنیا ایسے خیالات کی فرسودگی پر قہقہہ لگاتی ہے اس کو نہیں معلوم کہ کسی چیز کی فرسودگی اس کے ابطال کی دلیل نہیں ہوا کرتی حقیقت جتنا ہی زیادہ پرانی ہوگی اتنا ہی زیادہ سنگیں بھی ہوگی۔ حشر و معاد کا تصور انسان کی فطرت میں ہے دنیا میں جتنے مذاہب ظہور پذیر ہوئے ان سب کی بنیاد اسی سوال پر رہی ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ مومن ہو یا منکر۔ ملحد ہو یا صوفی۔ دہریہ ہو یا متکلم اگر وہ اپنے نفس کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لے تو معلوم ہوگا کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کے اندر یہ اندیشہ موجود ہے کہ جس زندگی کی ابتدا یوں ہوئی اور جو یوں نامکمل رہ گئی اس کا موت کے بعد کیا حشر ہوگا۔ ظاہر پرست یورپ جو مادیت اور افادیت کا مبلغ اور علم بردار سمجھا جاتا ہے آج دنیا میں ہر ملک سے زیادہ اس سوال کی طرف متوجہ نظر آتا ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ آج یورپ میں جن علوم کا سب سے زیادہ چرچا ہے وہ تحلیل نفسی اور تحقیق روحانی ہیں اور یہ دونوں اس باب میں متفق ہیں کہ مرنے کے بعد ہمارے وہ میلانات و داعیات ابھریں گے جو اس زندگی میں دب کر رہ گئے اور جو علی الاعلان آسودہ نہ کئے جا سکے یہ بھی سب مانتے ہیں کہ ان میلانات میں سب سے زیادہ اہم اور ناقابل تردید وہ ہیں جن کا تعلق ہمارے جذبۂ زوجی یا شعور جنسی سے ہے۔ وہ اس کو شعور جنسی کہتے ہیں ہم اس کو زیادہ لطیف اور پر کیف پاتے ہیں اور عشق کہتے ہیں بہرحال یہ مسلم ہے کہ ہمارے وہ جذبات ہماری روح سے لپٹے رہیں گے جو دنیا میں خاطر خواہ آسودہ نہ ہو سکے۔ پھر اگر آسی یہ کہتے ہیں تو کیا غلط ہے۔

؎ غبار ہو کے بھی آسی پھرو گے آوارہ
جنون عشق سے ممکن نہیں ہے چھٹکارا

آج کل حیات انسانی کا سب سے زیادہ سنگین مسئلہ یہی ہے اور شاید ہبوط آدم سے لیکر اب تک ایسا ہی رہا ہے۔ اب ہم آسی کے دو چار اور اشعار ایسے سناتے ہیں جن کا موضوع موت اور قیامت ہے اور جو ہمارے خیال کی مزید تشریح و توثیق کرتے ہیں۔

فتنہ زار حشر سب سمجھتے ہیں جس میدان کو
دامن ناز نگہ کا گوشۂ جنبیدہ ہے

ہم سے بے کل سے وعدۂ فردا
بات کرتے ہو تم قیامت کی

اے شب گور وہ بیتابی شب ہائے فراق
آج آرام سے سونا میری تقدیر میں تھا

آل اس کا قیامت ہے قیامت
وہ آفت کی جگہ ہے وارفانی

اب تو دیدار دکھا دیجئے تقصیر معاف
ہوگیا وعدۂ فردا ہی قیامت مجھکو

ساتھ چھوڑا سفر ملکِ عدم میں سب نے
لپٹی جاتی ہے مگر حسرتِ دیدار ہنوز

آپ کہتے ہوں گے کہ میں نے صرف ایک عنوان یعنی قیامت پر اتنا وقت لے لیا۔ مجھے خود اس کا اعتراف ہے لیکن میں صرف یہ دکھانا چاہتا تھا کہ آسی کی ذات اور ان کی شاعری کی ایک ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ ان کے چند مخصوص اور متعین تصورات واعتقادات ہیں جن میں آسی کو اسی قدر غلو اور انہماک ہے جس قدر کسی کٹر سے کٹر مذہبی شخص کو اپنے مذہب میں ہوسکتا ہے آپ لوگوں کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ آسی قیامت کا ذکر محض شاعری کی رسم ادا کرنے کے لئے نہیں کرتے۔ ان کے ذہن میں قیامت کا ایک خاص تصور ہے اور وہ اس کی بابت ایک اعتقاد رکھتے ہیں۔ یہی آسی کی ساری شاعری ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اور جب کہتے ہیں ایک خاص تصور کے ماتحت اور ایک شدید اعتقاد کے ساتھ کہتے ہیں جس میں ان کو انہماک ہوتا ہے۔ مثلاً

دل دیا جس نے کسی کو وہ ہوا صاحب دل
ہاتھ آجاتی ہے کھودینے سے دولت دل کی

یا مثلاً یہ شعر:۔

کوئے محبوب سے کوئی بھی نکل سکتا ہے
اپنے اوہام ہوئے وادیٔ غربت مجھکو

شعر میں تشبیہ سے کام لیا گیا ہے اور تشبیہ بھی ایسی جس کو انوکھی کہنا پڑتا ہے۔ مگر یہ آسی کے تخیل کی شدید ہویت جس نے تشبیہ کو عین واقعہ بنا دیا ہے اور شبہ اور مشبہ بہ میں کوئی اِمتیاز باقی نہیں رہنے دیا ہے۔ "اوہام" کو "وادیٔ غربت" بتانا!۔ اگر کوئی اور کہتا تو ہم اس کو محض شاعری یعنی ایک دور از کار خیال سمجھتے۔ لیکن آسی کا خلوص جذب اور زبان و دل کی یک آہنگی ہے جس نے اس نرالے تخیل کو ہمارے لئے اقلیدس کا ایک ایسا مقالہ بنا دیا ہے جو کسی ثبوت کا محتاج نہیں ہے۔ ہم سب سنتے ہی مان لیتے ہیں کہ ہمارے "اوہام" ہی ہمارے لئے "وادیٔ غربت" بنے اردو میں اس قبیل کا صرف ایک شعر مجھے یاد ہے جو میر کے مشہور اشعار میں سے ہے۔

عمر بھر کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا
اس کی دیوار کا سر سے مرے سایا نہ گیا

آسی نے ہم کو اس خطرہ سے بھی آگاہ کر دیا ہے کہ ہمارے "اوہام" ہم کو کوچۂ دلدار سے نکال بھی سکتے ہیں اور اسکی دیوار کا سایہ" ہمارے سر سے جا بھی سکتا ہے۔

آسی رمز و کنایہ کے قائل ہیں وہ جانتے ہیں کہ "دشنۂ و خنجر" یا "بادہ و ساغر" کے بغیر گفتگو میں کام نہیں چلتا۔ وہ تشبیہ و استعارہ کو بیان و حقیقت کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ کہنا شاید زبردستی نہ ہو کہ آسی مجاز کو "قنطرۃ الحقیقت" نہیں بلکہ عین حقیقت مانتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کی شاعری میں جو کافی حد تک تشبیہ و استعارہ اور رمز و کنایہ کی شاعری ہے اتنی تاثیر اور لذت نہ ہوتی کہ اس پر "غزل میر" کا اطلاق ہوسکے۔

آسی کے کلام کی مجموعی خصوصیت گسستگی اور تبتل ہے یعنی سب کچھ چھوڑ کر محبوب کی طرف نہ صرف آجاؤ بلکہ اسی میں محو ہو جاؤ۔ لیکن یہ محویت کوئی مجہولی کیفیت نہیں ہے۔ آسی کے وہاں عشق ایک جداگانہ

مذہب ہو گیا ہے۔ اور ان کی شاعری کو اس مذہب کی انجیل سمجھنا چاہیئے۔ وہ عشق کی بشارت لے کر آئے ہیں۔ اور ان کا پیغام یہ ہے کہ بے عشق زندگی بے کیف ہے۔ ایک شعر میں کہتے ہیں۔

عین معنی ہے وہ دل عاشق معنی جو ہوا
ہائے وہ لوگ جو دلدادۂ صورت بھی نہیں

بیساختہ حافظؔ کا یہ شعر یاد آ گیا:۔

بروزِ حشر ندانم چہ عذر خواہی گفت
کسے کہ دوست ندارد جمال زیبا را

آسیؔ نے عشق کو محض ایک وجود بے کیف یا انفعالیت نہیں سمجھا ہے۔ عشق نام ہے محبوب میں جذب ہو کر یکسر حرکت واضطراب ہو جانے کا اور یہ حرکت واضطراب کوئی عصبی ہیجان نہیں ہے۔ عشق سے مراد وہ مستقل اور پیہم سعی وعمل ہے جس کا تعلق بیک وقت جسم۔ دل۔ دماغ۔ روح غرضکہ انسان کی ساری ہستی سے ہے۔ عشق اور حسن دونوں لازم ملزوم ہیں اور ایک دوسرے سے جدا نہیں کئے جا سکتے۔ دونوں کو مل کر انسان کے مقدر کی تحسین وتکمیل کرنا ہے۔ اس لئے عشق مجہولیت اور بے کیفی سے اسی قدر دور ہے جس قدر کہ حُسن جنُن اور عشق ایک دوسرے کو کبھی مردہ نہیں ہونے دیتے۔ دونوں ایک دوسرے کے اندر ذوق عمل اور نشاط کار پیدا کئے رہتے ہیں۔ یہ تین شعر سنیئے اور آسیؔ کے پیغام کو سمجھنے کی کوشش کیجئے:۔

ذوق افزائے جنوں ہے اشتیاق ہم مجھے
دل مرا درکار اس کو اور اس کا غم مجھے
بس وہیں سمجھا ملی جب کسوتِ آدم مجھے
عالم عنصر میں بنایا مرکزِ عالم مجھے
واقعی صہبائے ذوق جلوہ مستی سوز ہے
وجد میں لاتی ہے آسیؔ حالت شبنم مجھے

ذرا اس نوید کامرانی کو بھی سنیئے:۔

ہوا کے رخ تو ذرا آ کے بیٹھ جا اے قیس
نسیم صبح نے چھیڑا ہے زلف لیلیٰ کو

آسیؔ کے دل میں جو دائمی کیف ونشاط موجود ہے اس کا فیض یہ ہے کہ وہ حسن وعشق کے بازار کو کبھی سرد نہیں پاتے۔

حسن کی کم نہ ہوئی گرمی بازار ہنوز
نقد جاں تک لئے پھرتے ہیں خریدار ہنوز

آسیؔ عشق مجازی اور عشق حقیقی کی بحث میں نہیں پڑتے عشق بہرحال عشق ہے جس میں "دردِ سر" نہیں بلکہ "دردِ دل" اور "دردِ جگر" درکار ہوتا ہے۔ یہ عشق آخر ہو کس کے ساتھ؟ یہ اپنے اپنے حوصلہ اور اپنی اپنی توفیق پر منحصر ہے۔ بلجیم کے مشہور صوفی تمثیل نگار مارس میٹرلنگ کا خیال ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جس نے عشق کیا ہو اور عشق سے اپنی روح کی عظمت اور برگزیدگی میں اضافہ نہ کیا ہو چاہے اس کا عشق کتنا ہی سفلی کیوں نہ ہو آسیؔ نے کھلے الفاظ میں کہیں یہ تلقین نہیں کی ہے مگر ان کی شاعری کا عام لہجہ اور عام اشارہ یہی ہے کہ عشق مقصود بالذات ہے جو تمام اضافتوں سے بالاتر ہے جو کسی کے ساتھ منسوب ہو سکتا ہے جب تک عشق عشق ہے ہم کو یہ سوال نہ اٹھانا چاہیئے کہ کس کے ساتھ ہے۔

مردم از عشق مراد دو جہاں می جستند
صائب از عشق ہماں عشق تمنائی کرد

یہی وجہ ہے کہ ہر پڑھنے والا عام اس سے کہ وہ شعور محبت کی کس منزل پر ہے آسیؔ کی شاعری کو اپنے سے بہت قریب پاتا ہے اور اس کو ماننا پڑتا ہے۔

آسیؔ مست کا کلام سنو
وعظ کیا پند کیا نصیحت کیا؟

مشرق کے صوفی شاعروں میں صرف دو ہستیاں

ایسی نظر آتی ہیں جنھوں نے مجاز کی حقیقت اور قدسیت کو کماحقہٗ تسلیم کیا ہے اور جن کے مسلک کو "مجازیت" کہا جا سکتا ہے۔ ایک تو حافظ۔ دوسرے آسیؔ۔ ذرد کے تصوف کی دھوم محض تاریخ شعر اردو کی ایک رسم ہے۔ وہ خود کتنے ہی زبردست صوفی کیوں نہ رہے ہوں لیکن شاعری میں ان کا شعور عشق بہت نیچی سطح پر ہے اور وہ معاملۂ عشق میں محض ایک نو آموز معلوم ہوتے ہیں۔ آتش میں تصوف اور تغزل دونوں کے قوی اور شدید امکانات موجود تھے لیکن زمانہ اور ماحول نہ ان کے تصوف کو اچھی طرح نمایاں ہونے دیا نہ تغزل کو۔ آسیؔ کے وہاں تصوف اور تغزل حقیقت اور مجاز دونوں ایک مزاج ہو کر نمایاں ہوتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حقیقت والے اس کو حقیقت سمجھتے ہیں اور مجاز والے مجاز۔ مثال کے طور پر ایک شعر سنیئے:۔

بس تمھاری طرف سے جو کچھ ہو
میری سعی اور میری ہمت کیا!

نوراً خیال "السعی منی والاتمام من اللہ تعالیٰ" کی طرف جاتا ہے۔ لیکن الفاظ میں جو سیدھا پن ہے اور لب و لہجہ میں جو ملائمت اور گداز ہے وہ اس شعر کو عام اور ہمہ گیر بنائے ہوئے ہے۔ ایک دائم الخمر اپنے بازاری محبوب سے بھی یہی کہہ سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنے محبوب کے ساتھ آتنا ہی خود فراموش ہو اور معیار عشق پر پورا اترتا ہو۔ اور آسیؔ کا معیار عشق کیا ہے؟ وہ بھی سن لیجئے:۔

۵ عاشقی میں ہے محویت درکار
راحت وصل و رنج فرقت کیا

اسی غزل کا ایک اور شعر سننے سے تعلق رکھتا ہے:۔

۵ نہ گرے اس نگاہ سے کوئی
اور افتاد کیا مصیبت کیا؟

اگر یہ خیال کسی اور شاعر کو سوجھتا جو رعایت لفظی ضروری سمجھتا تو یہ شعر الفاظ کی بازیگری ہو کر رہ جاتا اور اس میں کوئی تاثیر نہ ہوتی۔ لیکن جیسا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہو گیا ہوگا۔ آسیؔ کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ وہ تمام آرائش اور تکلف کے باوجود اپنے کمال کو اس تاثیر سے بھر دیتے ہیں جو خلوص اور سادگی سے پیدا ہوتی ہے تشبیہات و استعارات کی شاعری دنیا میں بہت کم تاثیر کی شاعری ہو سکی ہے۔ مگر آسیؔ کے دل میں کیفیت پہلے پیدا ہوتی ہے اور تشبیہات و استعارات اور دوسرے مناسبات بعد کو سوجھتے ہیں۔ اسی لئے ان کے تشبیہات و استعارات بھی ان کے جذبات و تاثرات کے لازمی عناصر بن جاتے ہیں۔ اور صورت و معنی میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا جو شعر ابھی سنایا گیا ہے اس پر غور کیجئے۔ ظاہر ہے کہ "گرنا" اور "افتاد" میں رعایت ملحوظ ہے۔ لیکن شاعر خود اس قدر متاثر ہے اور اس رعایت کی واقعیت کو اس شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہے کہ آج ہر سننے والے کو اس کی واقعیت ایک نہایت عام بات معلوم ہو رہی ہے۔ لفظ اور معنی کو ایک کر دینا اس کو کہتے ہیں۔ "گرے" کے لغوی معنی "گرنے" کے استعاراتی معنی "نگاہ سے گرنے" کا محاورہ۔ "افتاد" اور "مصیبت" سب ایک ہی حالت کے مختلف نام ہیں:۔

اس غزل کے دو اشعار اور سن لیجئے:۔

۵ جن میں چرچا نہ کچھ تمھارا ہو
ایسے احباب ایسی صحبت کیا
جاتے ہو جاؤ ہم بھی رخصت ہیں
ہجر میں زندگی کی مدت کیا

آسیؔ کی ہر بات ہمارے دل میں تیر کی طرح اتر جاتی
ہے اس لئے کہ وہ حال اور بیان حال میں کوئی فرق
باقی نہیں رہنے دیتے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو:۔

ع جو رہی اور کوئی دم یہی حالت دل کی
آج ہے پہلوئے غمناک سے رخصت دل کی

اگر کبھی بھی آپ کے دل کی یہ حالت رہ چکی
ہے تو اب آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ اس حالت کو بیان
کیسے کرتے ہیں۔ کسی قدیم مشرقی نقاد سخن کا یہ خیال
بہت صحیح ہے کہ اصلی شعر وہ ہے کہ ہر سننے والا سمجھے
کہ یہ تو میں بھی کہہ سکتا تھا لیکن جب کہنے بیٹھے تو معلوم
ہو کہ واقعی اس کے لئے کس دلسوزی اور جگر خراشی
کی ضرورت ہے۔ آسیؔ کا یہ شعر ایسا ہی ہے۔ اس
غزل کے تین شعر اور پیش کرنا چاہتا ہوں:۔

ع کوچۂ یار سے گھبرا کے نکلنا کیا تھا
دل کو شکوے ہیں مرے مجھکو شکایت دل کی

اگر آپ کو زندگی میں کبھی بھی "کوچۂ یار"
سے سابقہ رہا ہے اور اگر آپ کے اندر حمیت عشق کا
کچھ بھی اثر باقی ہے تو آپ کے دل کو آپ سے اور آپ
کو اپنے دل سے یہی شکایت ہوگی۔

اس شعر میں وحشت دل کا کیا بے تکلف اور
بے ریا نقشہ کھینچا گیا:۔

ع گھر چھٹا شہر چھٹا کوچۂ دلدار چھٹا
کوہ و صحرا میں لئے پھرتی ہے وحشت دل کی

مقطع میں جس تسلیم و رضا کی ترغیب دی گئی ہے
وہ منتہائے عشق ہے اور ہر عاشق کے مقدر کی چیز
نہیں ہے:۔

راستہ چھوڑ دیا اس نے ادھر کا آسیؔ
کیوں بنی رہگذر یار میں تربت دل کی

آسیؔ کے کلام کے مطالعہ کے بعد ماننا
پڑتا ہے کہ کامیاب ادب میں لفظ اور معنی کے درمیان
کوئی دوئی نہیں رہتی۔ لفظ ہی معنی اور معنی ہی لفظ
ہوتا ہے۔ شاعر کا کام نہ صرف یہ ہے کہ معنی کے لئے
لفظ تلاش کرے بلکہ اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے
کہ لفظ کے معنوی کیفیت کو بڑھا دے۔ مسیح کا معجزہ
کچھ اس سے زیادہ نہ تھا۔ الفاظ وہی تھے جو لغت
میں صدیوں سے موجود تھے۔ صرف ان کی معنوی
کیفیت اور معنوی شدت اتنی بڑھ گئی تھی کہ مردوں
میں بھی جان پڑجاتی تھی۔ آسیؔ نے اپنے بہترین
اشعار میں یہی کیا ہے۔ وہ فرسودہ سے فرسودہ لفظ
کو ایسے وقت اور ایسی ترکیب کے ساتھ لاتے ہیں
اور اس کے اندر ایسی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں کہ
وہ لفظ ہمارے لئے بالکل نیا ہو جاتا ہے۔ اس
وقت مجھے ان کی ایک رباعی یاد آرہی ہے۔

غنچے! تجھے میری دلفگاری کی قسم
شبنم! تجھے میری اشکباری کی قسم
کس گل کی نسیم صبح خوشبو لائی
بیتاب ہے دل جناب باری کی قسم

ذرا اس "جناب باری" پر غور کیجئے گا۔ کس قدر
عام اور پرانی اصطلاح ہے لیکن آسیؔ نے جیسا کہ اسکو
نئے معنوی کیفیت سے بھر دیا ہے اس کا اندازہ نہیں
کیا جاسکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر آخر میں یہ قسم
نہ کھائی گئی ہوتی تو نہ شاعر اس حالت کو پوری طرح بیان
کرسکتا اور نہ ہم خاطر خواہ اس سے متاثر ہو پاتے
شاعر کی زبان قسم کی تہذیب و تحسین کرتی چلی گئی
ہے یہانتک کہ اس کی قسم اس کی حالت پر محیط
ہوگئی ہے۔

چند خالص استعاری انداز کے اشعار سنئے
جن میں صرف استعارہ سے کیف و جذب پیدا
کیا گیا ہے۔

ناتوانوں کے سہارے کو ہے یہ بھی کافی
دامن لطف غبار پس محمل دینا

کیا اس شعر نے "غبار پس محمل" کو ہمارے لئے ایک جاندار حقیقت نہیں بنا دی ہے؟

یا یہ شعر:-

ذوق میں صورت موج آکے فنا ہو جاؤں
کوئی بوسہ تو بھلا اے لب ساحل دینا

اگر استعارہ اس قدر کامل ہو اور اس میں ایسی لازمیت پائی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس میں تاثیر نہ ہو۔ استعارہ اس وقت بے اثر ہوتا ہے جبکہ وہ ہمارے کسی خیال یا جذبہ پر حاوی نہ ہو سکے۔ آسی کا ہر استعارہ اضطراری ہوتا ہے اور اس میں آورد کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ ان کے دیوان میں ایسے اشعار کی بھی کثرت ہے جو سیدھے سادے ہیں اور جن کی تاثیر کا راز ان کی سادگی اور معصومیت میں ہے۔ مثلاً اسی غزل کے یہ دو شعر:-

ہائے رے ہائے تیری عقدہ کشائی کے مزے
تو ہی کھولے جسے وہ عقدۂ مشکل دینا

درد کا کوئی محل ہی نہیں جب دل کے سوا
مجھ کو ہر عضو کے بدلے ہمہ تن دل دینا

یا یہ غزل:-

پسند آئے تو لے لو دل ہمارا
مگر پھر دل بھی کس قابل ہمارا

چھری بھی تیز ظالم نے نہ کر لی
بڑا بے رحم تھا قاتل ہمارا

نہیں ہوتا کہ بڑھ کر ہاتھ رکھدیں
تڑپتا دیکھتے ہیں دل ہمارا

نہ آنا ہم تمہارا دیکھ لیں گے
جو نکلا جذب دل کامل ہمارا

لیکن اسی غزل میں یہ شعر بھی ہے۔

دل گردوں سے لیکر تا دل دوست
گیا نالہ کئی منزل ہمارا

ہم ان تمام منزلوں کو احاطہ کرنے سے قاصر ہیں جو ہمارے دل سے دل گردوں تک اور پھر دل گردوں سے دل دوست تک حائل ہیں اور جن کو ہمارا شاعر اس سہولت کے ساتھ بات کی بات میں طے کر گیا ہے اس کے لئے جس کائناتی بصیرت Casmic اور جس مافوقی تخیل Transundented Imagination کی ضرورت ہے وہ ہر شخص کے نصیب کی چیز نہیں۔

آسی کی شاعری اس بات کا پورا پتہ دیتی ہے کہ وہ صاحب کیف و حال تھے۔ اور یہ کیف و حال صوفیانہ سے کہیں زیادہ عاشقانہ تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ آسی کے تجربہ میں کیف و حال کی یہ تقسیم تھی ہی نہیں۔ ان کا ہر شعر ایک وجد ہوتا ہے اور اس مقام کی خبر دیتا ہے جہاں خارجی اور داخلی میں کوئی امتیاز نہیں کیا جا سکتا جہاں گرد و پیش کی ہر حالت ایک کیف باطن ہو جاتی ہے جہاں محبت کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا اور "نظر و ناظر و منظور" سب مل کر ایک ہو جاتے ہیں آسی چونکہ زندگی اور محبت کے تمام درمیانی اور ادنیٰ مراحل و منازل طے کر کے اس منزل پر پہنچے ہیں اور جن جن صعوبتوں اور مشقتوں سے ان کو دوچار ہونا پڑا ہے ان کو بھولے نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی ماہیت اور اہمیت کے اب بھی قائل ہیں۔ اس لئے جب وہ کوئی بات کہتے ہیں تو اس میں ان مرحلوں اور صعوبتوں کی بھی پوری جھلک ہوتی ہے لیکن وہ بات ہوتی ہے ان کی اپنی منزل سے۔ اسی لئے ان کی شاعری ہمارے اندر کسی قسم کی دوری یا اجنبیت کا احساس پیدا کئے ہوئے بغیر ہم کو غیر شعوری طور پر رفعت و تمکین کے احساس سے معمور کرتی رہتی ہے۔

آسیؔ کے کلام سے ہمارے اندر کبھی افسردگی یا بیدلی نہیں پیدا ہوتی۔ جیسا کہ بعض دوسرے متغزلین کے مطالعہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کا سوز و گداز ہمارے دل میں جینے کی ایک نئی تاب پیدا کر دیتا ہے۔ ان کی دردمندی میں نشاط کا ایک پہلو ہوتا ہے جو نمایاں ہوتا ہے۔ وہ محبت کے غم کو زندگی کی اپج بنا دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے کلام میں وہ اثر ہے جو تیر کی خاص شان ہے۔ ایک غزل کے کچھ اشعار سنیئے:-

اسی کے جلوے تھے لیکن وصال یار نہ تھا
میں اس کے واسطے کس وقت بے قرار نہ تھا
خرام جلوہ کے نقش قدم تھے لالہ و گل
کچھ اور اس کے سوا موسم بہار نہ تھا
غلط ہے حکم جہنم کسے ہوا ہو گا
کہ مجھ سے بڑھ کے تو کوئی گناہگار نہ تھا
وفور بے خودیٔ بزم سے نہ پوچھو رات
کوئی بجز نگہ یار ہوشیار نہ تھا
لحد کو کھول کے دیکھو تو اب کفن بھی نہیں
کوئی لباس نہ تھا جو کہ مستعار نہ تھا
تو محو گلبن و گلزار ہو گیا آسیؔ
تری نظر میں جمال خیال یار نہ تھا

آج تک میری نظر سے غالبؔ کے علاوہ اردو میں کوئی شاعر ایسا نہیں گزرا ہے جس کی ایک ایک غزل میں اتنے اشعار قابل انتخاب نکل آتے ہوں اور اگر آپ لوگ انصاف کریں تو میرے اس انتخاب کو جوش عقیدت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ پہلے شعر میں وصل کا جو بلند اور ناقابل حصول تصور پیش کیا گیا ہے اور جس طرح یہ ذہن نشین کیا گیا ہے کہ تڑپتے رہنا عاشق کا فطری منصب ہے اس کی دوسری مثال مشکل سے ملیگی۔ دوسرے شعر میں ذوات و اعیان اور مظاہر و حوادث میں جو ازلی تعلق ہے اس کو جس حسن اسلوب کے ساتھ واضح کیا گیا ہے وہ نہایت دلپذیر ہے۔ تیسرے شعر میں جس اعتماد اور جس اطمینان کے ساتھ اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا اعتراف کیا گیا ہے وہ ان کمزوریوں اور خامیوں کو سراسر توانائی اور پختگی بنائے ہوئے ہے اس کے بعد کے دو شعر ایسا تیر کی طرح دل میں بیٹھ جاتے ہیں کہ شاید ہی کوئی نقاد سخن ان کو انتخاب سے خارج کرنا گوارا کرے۔ مقطع میں استغراق کی جو نئی تخئیل ہے اور جس حسن کے ساتھ بیان کی گئی ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ شاعر "جمال یار" کے خیال میں نہیں بلکہ "خیال یار" کے جمال میں محو ہو جانے کی تحریک کر رہا ہے اور جو لوگ ایسا نہیں کر سکتے اور دوسرے مظاہر میں بہل جاتے ہیں ان کو مورد طعن سمجھتا ہے۔

اگر محض فنی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو بھی آسیؔ کو ایک قادر الکلام شاعر ماننا پڑتا ہے۔ اسلوب اور زبان میں بھی ان کا ایک مرتبہ ہے۔ اگر وہ اثر و تاثیر میں متقدمین سے آنکھیں ملا سکتے ہیں تو زبان اور رعایات و تکلفات میں متاخرین سے بھی جوہر کم نہیں ہیں اور پھر اس امتزاج کو انھوں نے کس قدر حسین اور دلفریب بنا دیا ہے اب آخر میں ان کی غزلوں سے ہر قسم کے اشعار منتخب کر کے سناتا ہوں تاکہ آسیؔ کے متعلق جتنی باتیں کہی گئی ہیں ان کی خاطر خواہ تشریح و تائید ہو سکے۔

وفا دشمن ہو تم یا ہو جفا دوست
بہر صورت مجھے رہنا رضا دوست
کوئی دشمن ہو یا آسیؔ مرا دوست
میں سب کا دوست کیا دشمن ہو کیا دوست
ترقی اور تنزل کی نہ پوچھو ...
میں دشمن ہو گیا دشمن ہوا دوست
مجھے نیرنگ دل نے مار ڈالا
یہ دشمن کا ہے دشمن دوست کا دوست
فریب عالم صورت سے بچنا
نہیں کوئی کسی کا جز خدا دوست

فقیروں کا بنا لو بھیس آتی
وہ شاہنشاہِ خوباں ہے گدا دوست

عشق میں کہتے ہیں کاہل آتشِ دلگیر تھا
آہ جس کی بے اثر تھی نالہ بے تاثیر تھا
حالت دل خاک میں کہتا کہ تا ہنگام مرگ
آپ کا شکر جفا یا شکوۂ تقدیر تھا
عشق نے فرہاد کے پردے میں پایا انتقام
ایک مدت سے ہمارا خون دامنگیر تھا
وہ مصور تھا کوئی یا آپ کا حسن شباب
جس نے صورت دیکھ لی اک پیکر تصویر تھا

نقش دو جہاں گردش پیمانۂ دل تھا
کل روز ازل نعرۂ مستانۂ دل تھا
خوشبو وہی رنگت وہی مستی بھی اسی کی
کعبہ میں بھی دور سے میخانۂ دل تھا
ذوق غم واندوہ محبت کے میں صدقے
جو داغ دیا تم نے وہ جانانۂ دل تھا

آئینہ آپ کے نزدیک جو نامحرم ہے
آپ نے خاک نہ جانا کہ مجھے کیا غم ہے
عشق کہتا ہے دو عالم سے جدا ہو جانا
حسن کہتا ہے جدھر جاؤ نیا عالم ہے
میرے دشمن کو نہ مجھ پر کبھی تا بو دینا
تم نے منہ پھیر لیا آہ یہی کیا کم ہے
ایک عالم کے طلسمات میں جی چھوٹ گیا
ہر ادائے نگہ ناز نیا عالم ہے

قطرہ میں کچھ نہیں پانی کے سوا کیا کہئے
بات کہنے کی نہیں ہے بخدا کیا کہئے

لالہ و گل میں اسی رشک چمن کی ہے بہار
باغ میں کون ہے اے باد صبا کیا کہئے
ایک ہستی کے سوا ہم نے نہ جانا کچھ بھی
اے نکیرین اب اور اس کے سوا کیا کہئے

بہر صورت طلب لازم آب زندگانی کی
اگر پایا خضر تم ہو نہ پایا تو سکندر ہو
کوئی تو پی کے نکلیگا اڑیگی کچھ تو بو منہ سے
در پیر مغاں پر مے پرستو چل کے بستر ہو
کسی کے در پہ آتشی رات رو رو کر یہ کہتا تھا
کہ آخر میں تمہارا بندہ ہوں تم بندہ پرور ہو

ایک جلوے کی ہوس وہ دم رحلت بھی نہیں
کچھ محبت نہیں ظالم تو مروت بھی نہیں
جو دیا تو نے تری راہ میں سب کھو بیٹھے
ہاں اگر شکر نہیں ہے تو شکایت بھی نہیں

ٹکڑے ہو کر جو ملی کوہکن و مجنوں کو
کہیں میری ہی وہ پھوٹی ہوئی تقدیر نہ ہو
وہ بھی کچھ عشق ہے جو درد کی لذت نہ چکھے
وہ بھی نالہ ہے جو حسرت کش تاثیر نہ ہو
جس کو دیکھا اسے چھاتی سے لگائے دیکھا
دل جسے کہتی ہے خلقت تری تصویر نہ ہو
حاصل صحبت غمناک بجز غم کیا ہے
دل مرا لیتے ہو ڈرتا ہوں کہ دلگیر نہ ہو
صاف دیکھا ہے کہ غنچوں نے لہو تھوکا ہے
موسم گل میں الٰہی کوئی دلگیر نہ ہو

سوئے دشت ایک قدم ایک ترے گھر کی طرف
سر میں سودا ہے تو ملنے کی تمنا دل میں

داغوں میں روشنئ شمع سرِ طور رہے آج
کون ہے اے شبِ غم انجمن آرا دل میں

کس دشت میں عشق نے تھکایا
ہر ریگِ رواں ہے کارواں سوز
اِس خلوتِ راز کے طلسمات
جو راز کھلا وہ رازداں سوز

یہ دونوں ایک ہی ترکش کے تین تیر
محبت اور مرگِ ناگہاں
علم کر خلد میں بھی خنجرِ ناز
تصدق ہے حیاتِ جاودانی

جو یہ کہہ ہے کوئی بلبل کی صورت نعرہ زن کیوں ہو
کوئی گلفام کیوں ہو گلبدن گل پیرہن کیوں ہو
تمھیں سچ سچ بتا دو کون تھا شیریں کی صورت میں
کہ مشتِ خاک کی حسرت میں کوئی کوہکن کیوں ہو

اس کا بھی تو اب پتہ نہیں ہے
لائے تھے یہاں دلِ حزیں ہم

کون اس گھاٹ سے اترا کہ جناب آسی
بوسہ لینے کو بڑھے ہیں لبِ ساحل کی طرف

دل جس سے مل گیا وہی نکلا بجائے دل
یا یوں کہو کہ کچھ بھی نہیں ہے سوائے دل

جنبش بھی کبھی اپنے ارادہ سے نہ کرنا
چلتے ہیں تو چلاتی ہے زنجیر ہماری

رات ہے، رات تو بس مردِ خوش اوقات کی رات
گریۂ شوق کی یا ذوقِ مناجات کی رات

کی نہ جوشِ جنوں میں نہ پاؤں میں طاقت
کوئی نہیں جو اٹھا لاوے گھر میں صحرا کو

نہ مرض کچھ ہے نہ آسیب نہ سایا ہم کو
اک پریزاد نے دیوانہ بنایا ہم کو

آج وہ ہیں مجمعِ احباب ہے
ایک مہجورِ آسی بے تاب ہے

اور کیا چاہتی ہے آرزوئے دل ان سے
کچھ نہیں حسن کی سرکار میں حسرت کے سوا

یہ ہے آسی کے کلام سے انتخاب۔ میں نے اول اول دو سو سے زائد اشعار کا انتخاب کیا تھا۔ لیکن پھر بیشتر ایسے اشعار کو نکال کر انتخاب کو مختصر کر دیا جو کافی مشہور و معروف ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہی غزل گوئی آسی کا حاصل عمر ہے اِس لئے کہ اردو شاعری میں جو چیز ان کو ہمیشہ زندہ رکھیگی وہ ان کی غزل ہے۔ ان کی شاعری کی سب سے نمایاں شان ان کی غزلیت ہے جو ان کی رباعیوں میں بھی موجود ہے۔ رباعی کی صنف میں بھی آسی کا ایک مرتبہ ہے۔ دو رباعیاں سنا چکا ہوں۔ چند اور سنیئے :۔

یا مجھکو ترا حسن نہ بھایا ہوتا
یا ہر رگ و پے میں آ سمایا ہوتا
یا دل ہی میں جلوہ گر اگر ہونا تھا
ہر جزوِ بدن کو دل بنایا ہوتا

کب تک کوئی اپنے دل کے غم کو روئے
کب تک کوئی یار کے ستم کو روئے
ہر دم یہ رلا رہی ہے الفت جس کی
اللہ کرے کہ اب وہ ہمدم کو روئے

جن سے رہ و رسم کی وہ رہزن نکلے
بھولا جنھیں سمجھے تھے وہ پُرفن نکلے
جان اپنی جن احباب کو ہم سمجھے آہ!
وہ دل کی طرح ہمارے دشمن نکلے

جس کی طبیعت میں یہ گداز اور جس کی زبان میں یہ نرمی ہو وہ کسی اور صنف سخن کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا شاید عشقیہ مثنوی میں بھی آسی کامیاب رہتے لیکن جس جذب و حال کے عالم میں وہ رہا کرتے تھے وہ مسلسل گوئی کے منافی تھا۔ اسی لئے انھوں نے غزل اور رباعی کے سوا کسی اور صنف کی طرف توجہ نہیں کی۔ دو قصیدے کہے ہیں جن میں ایک تو نواب کلب علی خاں والئی رامپور کی شان میں ہے اور مکمل ہے دوسرا میر محبوب علی خاں نظام دکن کی مدح میں ہے اور ناتمام ہے۔ ان قصیدوں میں فن کے اعتبار سے کوئی بات قابل لحاظ نہیں ہے۔ البتہ تشبیب دونوں قصیدوں کی خوب ہیں اور خالص غزل کا حکم رکھتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

کہاں ترا کوئی بحر وجود میں ثانی
حباب دیدۂ اہل نظر میں ہے پانی
کہے بہار لب گل سے میں بہار تو کیا
یہ شور کشتن منصور وائے نادانی
اگر یہ میں ہوں تو کیا تیری ذات ہے محدود
اگر یہ تو ہے تو پھر کیسا وجود امکانی

دوسرا قصیدہ یہ ہے:-

کسی کو دیکھ کے لغزش جو پاؤں میں آئی
شراب پی کہ وہ آنکھیں نہ ہوں کہیں بدنام
بس اتنے پر کہ لب لعل یار چوم لیا
میرے فرشتہ نے لکھا ہے مجھ کو مے آشام
کوئی کہے مجھے دیوانہ کوئی سودائی
تمہارے عشق نے کیا کیا کیا مجھے بدنام
کسی طرح کسی قالب میں انقلاب تو ہو
خدا کرے کہ جدائی ہو داخل ایام

حضرات آپ لوگوں کو شاید یہ شکایت ہو کہ میں نے خواہ مخواہ اتنا لمبا انتخاب پیش کر کے بات کو ضرورت سے زیادہ طول دیدیا جو محض میرے جذبۂ عقیدت اور بڑھے ہوئے حسن ظن کی دلیل ہے۔ اس کا ایک جواب تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تنقید بھی ادب ہی کی ایک صنف ہے اور لکھنے والے کے ذاتی ذوق اور اس کے اپنے جذبات سے کبھی الگ نہیں کی جا سکتی۔ لیکن یقین مانئے میرا اصل مقصد یہ تھا کہ خود آپ کو بھی فیصلہ کرنے میں سہولت ہو اور آپ خود تسلیم کر لیں کہ جس شاعر کا دیوان ایسے اشعار سے بھرا پڑا ہو اس کی شاعری کو تاریخ میں داخل نہ کرنا یا تو تصوف کا ایک غلط زعم اور بیجا رتبہ شناسی ہے یا پھر محض بد ذوقی اور بے بصری۔ اب آخر میں چند اور اشعار سنا کر اپنے مقالہ کو ختم کرتا ہوں اور آپ لوگوں سے رخصت چاہتا ہوں۔

اپنی عیسیٰ نفسی کی بھی تو کچھ شرم کرو چشم بیمار کے بیمار ہیں بیمار ہنوز
کیا خراباتیوں کو حضرت آسی نہ ملے
کہ سلامت ہے وہی جبّہ و دستار ہنوز
انھیں کانوں سے انا الحق کے سنے ہیں نعرے
آدمی عشق میں کیا جانئے کیا ہوتا ہے
ملنے کی یہی راہ نہ ملنے کی یہی راہ
دنیا جسے کہتے ہیں عجب راہگذر ہے
اب کہیں آسی نالاں ہے نہ قیس و فرہاد
کیا ہوئے کنگرۂ عرش ہلانے والے
بک گئے روز ازل پیر خرابات کے ہاتھ؛ ہم ہوئے تم ہوئے یا آسی میخوار ہوا

سراپا

صمد ساز رضوی

چہرہ منور، مہرِ درخشاں　　عارضِ روشن، ماہِ تاباں

برق نگاہیں، تارے آنکھیں　　کاکل پریشاں، ابرِ بہاراں

آواز لبریز موسیقیوں سے　　رہزنِ دل مضرابِ رگِ جاں

ہر قہقہہ گویا قلقلِ مینا　　ہر مسکراہٹ صبحِ خنداں

رنگین پیکر، حسن شرابی　　تخئیلِ فطرت، تحصیلِ امکاں

جانِ ملاحت، کانِ صباحت　　از سرتاپا روحِ گلستاں

مستی سراپا، شعرِ مجسم　　حسنِ مکمل، شاعر کا ارماں

اے ساز وہ دشمنِ ہوش آیا
مستانہ لغزش، رقصاں خنداں

شیر محمد اختر

بھگوان اور بھیل

" پھر وہی بھگوان ـــــــ "
" ناتھ ! آپ آگئے ـــــــ میرے بھگوان
تو نے میری سُن لی "
" اب تیرے سوا ـــ تیرے سوا کون مرا کرشن کنیا "
" بھگوان کنارے سے لگا دے میری نیا

پریم سروپ بیوی کی نقل اتارنے لگا۔ اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ پاربتی ـــــــ اس کی بیوی کرشن مورتی کے سامنے بیٹھی پوجا کر رہی تھی۔ پریم سروپ اور اس میں کتنا فرق تھا۔ اُن کی شادی کو چند سال ہی ہوئے تھے کہ پریم سروپ گھر سے باہر رہنے لگا۔ گھر میں آکر اُسے ایسا معلوم ہوتا گویا وہ کسی اُجڑی بستی میں آگیا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا گھر ایک آئیڈیل گھر ہو۔ وہ آئیڈیل جو اس نے سینما دیکھکر تیار کیا تھا۔ وہ زندگی کو ہیرو بن کر بسر کرنے کا خواہشمند تھا اور پاربتی کو وہ ہیروئن بنانا چاہتا تھا۔ مگر پاربتی ہیروئن بننا پسند نہ کرتی تھی۔ اس کے لئے پتی کی سیوا ہی دھرم تھا۔ مگر سروپ کو دھرم کے نام سے چڑ تھی۔

سروپ نے ایک برس اس متضاد احول کا مقابلہ کیا۔ اُسے بیوی سے محبت تھی۔ مگر وہ محبت جس کا وہ خواہشمند تھا۔ اُسے نہ مل سکی۔ وہ چاہتا تھا کہ ہیرو کی طرح اپنی محبوبہ کو وہ دبائے دبوچے۔ اس سے کھل کھیلے گھر کے کمرے فلم کے سین بن جائیں۔ دن عید اور رات شب برات ہو۔ مگر پاربتی کو سروپ کی اِن حرکات سے شرم آتی تھی۔ وہ پوجا پاٹ کرتی۔ گھر بار کا کام کاج کرتی۔ اور پھر سب سے زیادہ اسے اپنے پتی کی خدمت میں چین میسر آتا وہ پریم کی پوجا کرتی۔ مگر یہی پوجا پریم کو اور زیادہ چڑاتی۔

دونوں مخالف سمتوں میں جا رہے تھے۔ ایک کے لئے دھرم میں ہی سب کچھ تھا۔ مگر دوسرا دھرم کے نام سے چڑ جاتا۔ ایک دکھ کو سکھ جان کر برداشت کرتا گیا۔ مگر دوسرا زیادہ دکھ دیتا۔ شاید اس سے پاربتی اپنے خاوند کو سمجھ سکے۔ لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ خاوند پریشان ہو کر گھر سے باہر رہنے لگا۔ پاربتی اس کو منالے کے لئے بھگوان کو تنگ کرتی۔ سارا سارا دن اور رات وہ پوجا میں مصروف رہتی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اسی میں دھرم ہے۔ مگر پتی دیوتا کچھ اور چاہتا تھا اسے پجارن کی بجائے ایک حسین بیوی کی ضرورت تھی۔ ایسی بیوی جو اس کے جذبات کو بیدار کر سکے۔ جو اس کا ساتھی ہو۔ جو اس کے خیالات کی تعریف کر سکے۔

مگر ..... پاربتی نہ سمجھ سکی۔ پریم سروپ جب بھی آتا۔ شراب سے چور رہتا۔ آج وہ کئی دنوں کے بعد گھر آیا تھا۔ عین اسی وقت جب وہ دعا مانگ رہی تھی۔

اب تیرے سوا کون میرا کرشن کنیا
بھگوان کنارے سے لگا دے میری نیا

اور جب اس نے وہی الفاظ دہرائے تو ان میں کتنی طنز تھی۔ اس نے سامنے سونے کا کرشن کا بت دیکھا۔ یہ بت پاربتی میکے سے لائی تھی۔ اس کا رکھوالا

بھگوان —— پریم سروپ کو باپ سے ورثہ میں الحاد ملا تھا۔ وہ ایک برہمن کا بیٹا تھا۔ اس نے دھرم کی آغوش میں پرورش پائی تھی یہی وجہ تھی کہ بھگوان کے نام سے اسے نفرت تھی۔ وہ خوب جانتا تھا کہ اس نام سے کیسے لوٹا جاتا ہے۔ اور وہ لوگ کتنے سادہ ہوتے ہیں جو لٹ جاتے ہیں" پارو .... اِدھر آؤ ..... اِدھر" وہ جھوم گیا" ارے ادھر آؤ ..... یہ دیکھو تمہارے لئے کیا لایا ہوں .... تحفے ......"

ناتھ ......" پاربتی نے اس کے قدم چھوئے وہ تحفہ کا لفظ سن کر ہی فرطِ مسرت سے سرخ ہوگئی۔

"ہاں پارو تحفے .... وہ بنڈل کھولو ...."

پاربتی خوش تھی۔ بھگوان نے اس کی پرارتھنا سن لی۔ اس کا پتی گھر آگیا تھا۔ اور وہ اس کے لئے تحفے لایا تھا۔ وہ خوشی سے ناچ اٹھی۔ ایک مست ہرنی کی طرح وہ اٹھی۔ پریم کو سنبھالا اور اسے پلنگ پر بٹھا دیا۔ وہ ابھی تک اپنا فقرہ دہرا رہا تھا ...." پارو .... وہ بنڈل .... ہاں ہاں وہی ..... لاؤ ...... مجھے دو ......" پریم نے کانپتے ہاتھوں سے بنڈل کھولا۔ اس میں سے پلاسٹر کا ایک مجسمہ نکلا۔ یہ کرشن بھگوان کا مجسمہ تھا۔ چھوٹا سا خوبصورت اور سفید سا مجسمہ۔ پاربتی کو تو گویا ساری کائنات مل گئی۔ اس نے بیتابی سے بڑھکر وہ مجسمہ چھیننا چاہا۔ "میرے کرشن مراری" اس کے لب ہل رہے تھے۔ اشتیاق اور تقدس کے جذبات اس کے چہرے پر ایک نکھار پیدا کر گئے۔

"ہاں پارو .... یہ تیرے کرشن مراری ہی ہیں ...."

"ناتھ ......" وہ رک گئی۔ وہ اظہار شکریہ کے لئے الفاظ نہ پا رہی تھی۔ پریم سروپ جسے بھگوان کے نام سے بھی ضد تھی۔ وہ آج خود کرشن کی مورتی لیکر آیا تھا اپنی پاربتی کے لئے۔ یہ سب بھگوان کا کرشمہ تھا۔ اس کے بھگوان کا کرشمہ۔ اس نے پریم کا دل پھیر دیا تھا۔

"پارو .... یہ تو رہا تیرا بھگوان اب ذرا دوسرے پیکٹ کھولنا ....

ہاں ہاں مہاتما گاندھی .... ابوالکلام آزاد .... یہ بیل ہے ...."

پاربتی حیران ہوگئی۔ کرشن بھگوان۔ گاندھی جی۔ ابوالکلام آزاد۔ اور یہ بیل۔ آخر بیل کا کیا مطلب تھا۔ اور یہ مجسمے لانے کا فائدہ۔ پینے کا اثر دماغ پر ہوگیا ہوگا۔ تبھی بہک کر جو کچھ ملا۔ اٹھا لائے۔ وہ سوچ رہی تھی۔ کھلونے پلنگ پر رکھے تھے" تم بھی آؤ ......" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا .....

"پارو! پارو! آؤ آؤ۔ حیران کھڑی ہو۔ ارے کیوں ...... ؟ میں پگلا ہوں ...... ادھر میرا منہ کیوں تک رہی ہو ...... یہ تیرے کرشن اور گاندھی اور یہ میرے ابوالکلام آزاد .... پارو میں آج جا رہا تھا .... کہیں (تمہیں کیا اس سے) نکڑ پر۔ ارے یہی ہمارے بازار کی نکڑ پر .... یہ کھلونے رکھے تھے۔ میں نے خرید لئے" اس نے زور سے ایک قہقہہ لگایا۔ پاربتی کا سارا جسم کانپ گیا۔ اس کا قہقہہ کتنا خوفناک تھا۔ اس نے کرشن کا مجسمہ اٹھایا" یہ ۱۲ کا ہے۔ بارہ آنے ہا! ہا! ہا! اور تیرے گاندھی جی دس آنے ہا! ہا! ہا! ہا! میرے ابوالکلام آزاد ہا! ہا! ہا! جانتی ہو مجھے کیوں پیارے ہیں۔ وہ آزادیٔ وطن کے حامی ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد کے رہنما .... اری میں بھی ہندو مسلم اتحاد کا حامی ہوں۔ جس ہندستان میں وہ بستے ہیں وہاں ہندو مسلم فساد ہوتے ہیں۔ مگر میرے ہندستان

ہیں فساد نہیں ہوتے۔ مسلمان اپنے گلاس میں مجھے پلاتا ہے۔ پریم کا رس .... اور میں اسے پلاتا ہوں محبت کی شراب .... رس .... شراب۔ میں ہندو مسلم اتحاد کا حامی .... ارے اس دوکاندار نے مجھ سے، میرے محبوب لیڈر کے صرف آٹھ آنے مانگے .... آٹھ آنے .... ہا! ہا! ہا! اور یہ بیل .... اس کے دو روپے.. .... دو روپے ...." اس کے چہرے پر عجیب کیفیت تھی۔

"——میں نے جانا وہ پگلا ہے۔ اس نے پی ہوئی ہے۔ میں نے کہا دوست۔ بھگوان مہاراج، مہاتما گاندھی اور ابو الکلام آزاد آنوں میں بیچتے ہو۔ اور یہ بیل —— جانور دو روپے میں —— اور پارو! جانتی ہو اس نے کیا جواب دیا۔ ہاتھ باندھ کر کہنے لگا۔ باپو جی: کرشن مہاراج —— مہاتما گاندھی اور مولانا آزاد کے بت چھوٹے ہیں۔ اور بیل کا بت بہت بڑا۔ کارخانے والے مہنگا دیتے ہیں۔ اور میں نہیں جانتا ——" پریم نے پھر قہقہہ لگایا "پارو! تیرے بھگوان بارہ آنے میں .... بارہ آنے اور میرے آزاد آٹھ آنے میں اور بیل .... دو روپے میں دو روپے ...." وہ زور زور سے دیوانہ وار ہنسنے لگا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا .... "پارو اب ہم چلے .... ارے بھگوان کو سنبھال کر رکھنا بارہ آنے میں آیا ہے .... ہا! ہا! ہا! بیل مہنگا ملا۔ میرے میز پر رکھ دینا ...."

وہ باہر جانے لگا .... پاربتی نے اسے روکنا چاہا۔ مگر وہ نہ رکا۔ وہ دیوانہ وار ہنس رہا تھا ...." بارہ آنے بھگوان .... میرا آزاد .... آٹھ آنے ...." وہ جا رہا تھا"

پاربتی کے کانوں میں قہقہوں کی صدا گونج رہی تھی .... وہ حیران کھڑی مٹی کے کھلونے کو دیکھ رہی تھی۔ اور اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ مسکرا رہے ہیں۔ ان کی مسکراہٹ کتنی مہیب تھی۔

غزل

از جناب سکندر علی وجد

عزم و تخیل کی سخت خامی — کیسی فلاکت کیسی غلامی

خلوت سے ترساں جلوت میں حیراں — عاشق بچارے عارف نہ عامی

مقتل بنا دے گی رہ گذر کو — یہ نوجوانی یہ خوش خرامی

بیڑا کرے گی غرقاب اِک دن — کشتی نشینوں کی تشنہ کامی

پھولوں کے تختے ویراں پڑے ہیں — یہ باغباں کی بد انتظامی

بدنام اپنے، گمنام اپنے — اغیار سارے نامی گرامی

کس کو خبر ہے، کیا گل کھلائے
تیغ زباں کی یہ بے نیامی!

تسنیم مینائی

لال چندری

(۱)

"میں کہتی ہوں کہ آخر میرے لئے ایک لال چندری رنگوا دینے میں تمہارا کیا ہرج ہے کون سی اس میں شرع کے خلاف درزی ہوتی ہے جو تم کو اتنا تامل ہے۔ سات برس میری شادی کو ہوتے ہیں، قسم لو، جو تم نے ایک خواہش بھی میری پوری کی ہو، ہر بار یہی جواب ہے کہ "شرع کے خلاف" ہے۔ میں نہ عالم نہ فاضل معلوم نہیں کیا شرعاً جائز ہے اور کیا ناجائز، مگر اتنا ضرور سمجھتی ہوں کہ "لال چندری" اوڑھنا کسی طرح شرعاً منع نہیں۔ ابا جان کو خدا بخشے کیسے بڑے متشرع عالم تھے، مگر اماں نے میری ہی یاد میں کئی بار لال چندری اوڑھی، اور ابا جان نے کبھی نہیں ٹوکا۔ میں بھی تو آخر سنوں کہ وہ کیا بات ہے جس کی وجہ سے تم میرے لئے ایک لال چندری نہیں رنگوا سکتے۔ روپیہ پیسہ سب اللہ کا دیا گھر میں ضرورت سے زیادہ موجود ہے پھر کیا سبب ہے کہ میری ایک بات بھی نہ مانی جائے۔ ابھی کل بھابی جان آئی تھیں ان کے ساتھ ان کی چھوٹی بہن سلمہ بھی تھی دونوں سرخ چندریاں اوڑھے تھیں، کیسی خوش خوش تھیں اور ہونا بھی چاہیئے، ساون کا زمانہ ہے جھولے پڑے ہوئے ہیں چندریوں ہی کے دن ہیں۔ میں اگر جھولا نہیں جھول سکتی تو کیا چندری اوڑھنا بھی 'کفر' ہے"

صوفیہ اپنے والدین کی اکلوتی لڑکی تھی، اور دوسری اولاد، ماں کو مرے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے، باپ البتہ اس وقت مرے جب وہ گیارہ برس کی تھی، سلیم اس سے بڑا تھا اور باپ کے مرنے کے بعد سے سارے کاروبار کا مالک۔ محمد علیم تاجر چرم کے کارخانے کی یورپ تک ساکھ تھی۔ سلیم بہت ہوشیار تھا اور محنتی، باپ کے بعد بھی کارخانے اسی طرح بلکہ اس سے بہتر چلاتا رہا۔ صوفیہ شادی کے قابل ہوئی تو ماں نے نسبت کی تلاش شروع کی اس کی خوبصورتی اور ہنرمندی کے گھر گھر چرچے تھے، ہزاروں نہیں تو سیکڑوں پیام ضرور آئے ہونگے مگر سلیم کی عقل پر معلوم نہیں کیسے پتھر پڑ گئے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ، مالدار، خوب رو، خوش صفات پیاموں کو چھوڑ کر صوفیہ کا عقد مولوی خیرات علی سے کر دیا، ماں کتنا کتنا چیختی رہی کہ بیٹا صوفیہ کو تم ہی نے انگریزی تعلیم دلوائی ہے، خیرات علی کی نسبت سنا ہے کہ وہ بہت کٹر مولوی ہیں، بھلا ان سے اور صوفیہ سے کیسے نباہ ہوگا. پھر خیرات علی میں کیا خوبی ہے سوائے روپیہ کے۔ سو وہ اللہ کا دیا اپنے گھر میں کچھ کم ہے جو اس پر نظر کی جائے دوسرے اور دو چار نہیں سیکڑوں نسبتیں ایسی بھی ہیں جہاں دولت خیرات علی سے بھی زیادہ ہے مگر سلیم اللہ کے بندے نے ایک نہیں سنی، آنکھ بند کر کے عقد کر دیا نتیجہ تو پہلے ہی سے معلوم تھا۔ صوفیہ ہی ایسی تھی جو سات برس تک برداشت کرتی رہی، ماں نے تو شادی کے تیسرے برس ہی انتقال کیا، صوفیہ کی تکلیف کی اسکی

روح پر تکلیف تھی۔ شروع شروع میں تو سلیم یہی سمجھتا رہا کہ یہ سب ڈھکوسلے ہیں، مگر رفتہ رفتہ اسے بھی اندازہ ہو گیا کہ اس نے صوفیہ کو "دنیوی جہنم" میں ڈال دیا ہے، ہاتھ ملتا تھا۔ دیواروں سے ٹکریں مارتا تھا مگر مجبور تھا، صوفیہ سی بہن اور وہ بھی اکیلی، سلیم کو اس سے اور اس کو سلیم سے بہت محبت تھی، اسی تعلق کی بنا پر صوفیہ کی تکلیفیں اس سے دیکھی نہیں جاتی تھیں۔ کئی بار ارادہ کیا کہ صوفیہ کو طلاق دلوا دے، پھر بدنامی کے ڈر سے خاموش ہو رہا۔ صوفیہ بھی اللہ کی بندی ایسی صابر تھی کہ منہ سے کبھی شکایت کا لفظ نہیں نکلا۔ ساون کا زمانہ تھا، صوفیہ پھر آخر لڑکی تھی بائیس برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ بھاوج کو دیکھ کر لال چندری کا شوق اسے بھی ہوا، میاں سے فرمایش کی، انھوں نے پہلے تو ٹال مٹول کی، پھر صاف کہہ دیا کہ "میری مرضی نہیں" صوفیہ بھی انسان تھی اور گوشت پوست سے بنی ہوئی، رنج اور صدمے کے سبب سے ضبط نہ ہو سکا، اس نے بھی اپنے دل کی بھڑاس نکال ہی لی، سوچا یہ تھا کہ آج تک پلٹ کر میاں سے بات نہیں کہی ہے، آج اتنا کہوں گی تو شاید متاثر ہو جائیں۔ اور لال چندری رنگوا دیں اسے کیا معلوم تھا کہ "خیرات علی سے اتنا کہنا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنا ہے، صوفیہ کا اتنا کہنا تھا کہ انھیں" تاؤ آگیا:

"صوفیہ تم نے آج، وہ کیا ہے جو کسی شریف زادی کو نہیں کرنا چاہیئے۔ شرع کی خلاف ورزی ہونے کے علاوہ شوہر کو الٹ کر جواب دینا اور اس کی مرضی کا پاس لحاظ نہ رکھنا اخلاقی جرم بھی ہے، میں تمہیں دکھا دوں گا کہ اس حرکت کے نتائج کیا ہوتے ہیں:" اتنا کہہ کر خیرات علی کمرے سے باہر چلا گیا۔ اپنے کمرے میں جا کر ایک بکس میں کچھ کپڑے رکھے کچھ روپیہ رکھا ضروریات کی دو چار چیزیں ساتھ لیں اور گھر کو خدا حافظ کہا۔

(۲)

خیرات علی کے غائب ہو جانے کا صوفیہ کو اتنا صدمہ ہوا کہ صاحب فراش ہو گئی دل اور روح تو اس کے پہلے ہی سے بیمار تھے، اب جسم بھی اثر پذیر ہوا۔ سلیم کو اطلاع ہوئی تو صوفیہ کو گھر لے گیا، حکیم، ڈاکٹر، وید، جھاڑ پھونک والے سبھی کا علاج ہوا۔ سلیم کی بیوی کو صوفیہ سے اپنی بہن کی طرح محبت تھی اس نے جان توڑ کر تیمارداری کی مگر

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اسے جو چپ لگی تھی وہ کسی طرح نہ ٹوٹی۔ روز بروز کمزور ہوتی جاتی تھی، سلیم کا مایوس ہو کر یہ حال ہوا کہ کارخانے جانا، کاروبار کی طرف توجہ کرنا سب چھوڑ دیا، ہر وقت بہن کی پٹی کے پاس بیٹھا اس کی صورت دیکھا کرتا تھا؛ صوفیہ کے سامنے تو نہیں الگ چھپ چھپ کر روتا بھی تھا؛ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، کافی ہے۔ کسی سے سن لیا کہ "کلکتہ میں ایک انگریز ڈاکٹر ہے جو دق کا علاج کرتا ہے۔ صوفیہ کو ڈاکٹروں نے دق تجویز کی تھی۔ فوراً صوفیہ کو لے کر کلکتہ روانہ ہو گیا۔

(۳)

خیرات علی غصے اور غیظ کے عالم میں چل تو دیا، مگر ٹرین میں بیٹھ کر خیال آیا کہ صوفیہ سی بیوی جس نے کبھی تم سے تو نہیں کہا چھوٹی جا رہی ہے محبت نے سمجھایا کہ اگلے اسٹیشن پر اتر پڑ اور واپس چلا جا؛ اگلا اسٹیشن تھا جنگشن، وہاں اتر کر دوسری واپس لے جانے والی گاڑی کا انتظار کرنے لگے۔ قدرت کے کارخانے میں کسے دخل ہے، خود تو مولانا آدمی تھے، ٹرینوں سے واقفیت معلوم، قلی نے انھیں کلکتے والی گاڑی میں بٹھا دیا۔ وہاں پہونچے تو بے یار و مددگار کئی روز تو مارے مارے پھرے، روپیہ ساتھ زیادہ لائے تھے ایک ہوٹل میں کسی "کائیاں" نے انھیں بھانپ لیا کہ آدمی بیوقوف نہیں تو مولویت کے سبب سے دنیا کی

اونچ نیچ سے واقف ضرور تھے، اس کے پھندے میں آگئے اور اس نے انھیں ایک "بالاخانے" پر پہونچادیا، انھیں یوں دھوکا دیا کہ یہ ایک معزز ہوٹل ہے اور وہاں "نورجہاں" کو یہ پٹی پڑھائی کہ مال اچھا ہے اور موٹا، جانے نہ پائے، دو چار روز تو ڈوڈوں نے انھیں یوں ہی مغالطے میں رکھا پھر رفتہ رفتہ کھل کھیلنے لگے۔ خیرات علی آدمی بہت متشرع اور سوئی تھے مگر "بدی سے مقابلے" کی ان میں صلاحیت ہی نہیں تھی۔ پندرہ روز میں نورجہاں پر عاشق تھے اور اپنے عقائد میں تمزلزل۔ دو مہینے میں تو اس نے یہ حال کر دیا کہ داڑھی مونچھ سب منڈا کر پینے بھی لگے'۔—

دن بھر نورجہاں ہوتی تھی اور یہ۔ شام کا وقت تھا سورج غروب ہو رہا تھا۔ اس کی کرنیں لال لال شفق پر سے گزرتی ہوئی خیرات علی پر پڑ رہی تھیں۔ ٹھنڈی ہوائیں بھینی بھینی خوشبو تھی، جس نے خیرات علی کو مست کر دیا۔ سرور کے عالم میں نورجہاں سے گانے کی فرمائش کی، اور خود لیٹ کر سننے لگے۔

(۴)

سلیم صوفیہ کو کلکتہ لے کر آیا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر رخصت پر انگلستان گیا ہوا ہے۔ سفر کی تکان کا اثر اس پر بھی تھا، اور صوفیہ تو بالکل نڈھال ہو گئی تھی خیال کیا کہ تبدیلِ آب و ہوا سے صوفیہ کو بھی شاید فائدہ پہونچے۔ دریا کے کنارے ایک بنگلہ کرائے پر لیا، بنگلے کے سامنے ایک طوائف کا بالاخانہ تھا۔ سلیم کو آئے آٹھواں روز تھا کہ صوفیہ کی طبیعت اچانک بہت خراب ہو گئی۔ دوپہر سے بگڑی تو شام تک یہ حالت ہوئی کہ ڈاکٹر حکیم، سلیم سب مایوس ہو گئے، سلیم کو ہچکی لگی تھی، ڈاکٹروں کے جانے کے بعد سے صوفیہ کی پٹی پہ سر رکھے رو رہا تھا صوفیہ کے پلنگ کے پاس شیشے کی کھڑکی تھی، شفق آلود سورج کی کرنیں اس میں سے چھن چھن کر صوفیہ کے سفید لباس اور چہرے پر پڑ رہی تھیں، سرخی اور سفیدی کا اتصال ایسا معلوم ہوتا تھا، صوفیہ لال چندری اوڑھے ہے — صوفیہ نے نگاہِ واپسیں سے اس منظر کو دیکھا، قدرت کی ستم ظریفی پر لبوں پر مسکراہٹ آگئی، چہرے پر سکون تھا، آخری سانس کے ساتھ آنکھیں بند کریں، اور ہمیشہ کے لئے سو گئی!——

دور سے نورجہاں طوائف کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔

"چندریا لال رنگ دے، موری رے"

ماہر القادری

عقیدت کے پھول

صدقے ترے آئینۂ ہستی کو نکھارا
قربان ترے گیسوئے فطرت کو سنوارا

اللہ رے! تری شوکت و اجلال کا عالم
قدموں پہ ترے لوٹ گئی سطوت دارا

آتے ہی ترے دوڑ گئی خنکیٔ توحید
تھمتا ہی نہ تھا کفر کا چڑھتا ہوا پارا

تو نے ہی محبت کے سفینہ کو ترایا
ملتا ہی نہ تھا حسن کے دریا کا کنارا

تاریخ کے صفحات کو بھی ناز ہے جس پر
اِک گرتی ہوئی قوم کو اس درجہ اُبھارا

چلتی ہی رہے گی ترے احکام کی کشتی
بہتا ہی رہے گا ترے الطاف کا دھارا

اُس وقت کہ مٹھی میں تری سارا عرب تھا
کہتے ہیں ترا نانِ جویں پہ تھا گزارا

اس وقت بھی تھی تیری نبوت کی خدائی
آدمؑ کی بھی تقدیر کا چمکا نہ تھا تارا

اب بھی تری عظمت پہ کٹا دیتے ہیں سر کو
اب بھی ہے ترا نام ہمیں جان سے پیارا

اَب بھی ہیں تری نام کی عظمت کے فدائی
بغداد، فلسطین، سمرقند، بخارا

اے وہ کہ ترے ذکر میں تسکین دل و جاں
اے وہ کہ تری ذات دو عالم کا سہارا

اے وہ کہ ترے نام سے ٹلتی ہے مصیبت
ماہرؔ کی طرف چشم عنایت کا اِشارا

قیسی رامپوری

سامانِ جنگ

(اس افسانہ کا میری زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے)

ریلوے لائن سے میلوں علیحدہ اور لاری کی سڑکوں سے دور افتادہ پہاڑوں کے سنگین آغوش میں ریاست سرتسی واقع ہوئی تھی یہی وجہ تھی کہ وہاں ابھی شیاطین کا گزر نہیں ہوا تھا۔ ہاں فرشتے روز قلتا ریاں لاتے ہوئے آتے تھے حوریں خرام معصومانہ کرتی ہوئی نازل ہوا کرتی تھیں۔ اور بعض مرتبہ خود دیوتا اتر کر لوگوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔

اس ریاست کا نظام حکومت بھی نہ تو جمہوریت کی گندگی سے آلودہ تھا اور نہ آمریت کی کثافت سے ملوث تھا نہ یہاں نازی ازم کا فرعونانہ قہر تھا نہ فاشلیت کا مجنونانہ جبر اور نہ اشتراکیت کی ساحرانہ مہر۔ ایک مُسن راجہ چوپال میں رہا کرتا تھا جس کے قبضہ میں بیس آدمیوں کی زبردست فوج تھی تین ذاتی ملازم اور دو سو روپیہ کی سالانہ آمدنی ——— شکل سے چار سو آدمی بستے ہوں گے۔ سرتسی میں ہندو اور مسلمان ملا کر نہ تو کبھی کوئی مندر جلایا گیا اور نہ کسی وقت کوئی مسجد ڈھائی گئی تھی۔ ان کو باہمی فساد کے لئے کوئی مواد ہی نہیں ملتا تھا۔ مہاسبھا، کانگریس، مسلم لیگ، انگریز، سوراج، مگائے اور باجہ وغیرہ کے "اسرار" اگر کوئی ان کے سمجھانے کی کوشش بھی کرتا تو شاید وہ اس کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ یہ الفاظ ان کے لئے غیر ارضی سے تھے۔ وہ صرف دو باتوں کو سمجھتے تھے۔ کھیت جوتنا اور بارش کے لئے دعا کرنا۔ چنانچہ کھیتوں کی وسعت اور دعاؤں کی فراوانی ان کو اتنا غلہ بخش دیا کرتی تھی کہ ناج ان کے لئے سکہ، نوٹ اور ہنڈی بن گیا تھا۔ سود کی خون آشامی اور ساہوکار کی خسیت یہاں کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ ہر شئے کا مبادلہ ہوتا تھا۔ اول یہاں تو اشیا ہی کیا تھیں تھوڑا سا ناج تھا لیکن نہ اتنا کم کی اس کی قلت "یاروں" سے عشق ہی بھلا دے اور نہ اتنی کثرت کہ محض کھانے کے لئے زندگی کی آرزو پیدا ہو جائے ـ حسب ضرورت گڑ اور بقدر احتیاج روئی بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ ان میں سے کوئی بھی ایسی جنسی نہیں تھی جس کا احتکار یا احتباس سرمایہ داری کے بچے پیدا کر دیتا۔ اور نہ مساوات کی ایسی مجہول اسپرٹ تھی کہ اشتمالیت کو تولید کا موقع مل جاتا۔ میں جہانیان جہاں گشت میں سے تو نہیں ہوں ہاں غیر آباد خطہ اور پہاڑوں سے مجھے شروع ہی سے دلچسپی ہے چنانچہ جب میں پہلی بار اس عظیم الشان ریاست میں گھوڑے پر سوار اور ہیٹ سر پر رکھے ہوئے داخل ہوا تو یہاں کے لوگوں کے لئے ایک تماشہ بن گیا تھا جوان مجھے تیور بدلکر دیکھ رہے تھے۔

بوڑھے ہراس آمیز نظروں سے، بچے خوف زدہ آنکھوں سے اور عورتیں آشفتہ چتونوں سے دیکھ رہی تھیں۔

چند منٹ کے بعد مجھے ریاست کی پوری فوج نے جو بیس جرار سپاہیوں پر مشتمل تھی آگھیرا۔ ان کے بھیانک رنگ خوردہ بھالے ان کی دندانہ دار پرانی ہیبت ناک تلواریں اور ان کی کند چھوٹی چھوٹی سی کٹاریں میرے اوپر چھاگئیں میں نے اپنی آتشبار بندوق کو دیکھا جو چند ہی فیر میں اس لشکر کو بآسانی منتشر کر دینے کا وعدہ کر رہی تھی مگر سلاح سے جنگ کا کیا کام۔ میں اطمینان سے گھوڑے پر بیٹھا رہا آخر ریاست کا جری فیلڈ مارشل میرے قریب آیا اور گرج کر بولا "تم کون ہو؟"

اس کے جواب میں میں نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا جس کے جواب میں بیسں ہاتھ اٹھے میرے ہاتھ سے مس ہوئے اور مجھے فوراً شاہی دربار میں پہنچا دیا گیا۔

میری یہ کیفیت تھی گویا کوئی سفید آدمی Zulu Land میں آگیا ہے زلو خونخوار و مردم آزار قوم ہے اور یہ لوگ نہایت امن پسند تھے۔

مجھے یہاں کی سادہ زندگی اور قدرتی مناظر اس قدر بھائے کہ میں یہاں چند ماہ کے لئے رہ پڑا۔ سیر و شکار کبھی باجرہ کی اور کبھی گیہوں کی روٹی گھی کی غیر معین مقدار وغیرہ کے تو کہنے ہی کیا تھے۔

زندگی کا ایک ہمہ رس معیار بنانا دراصل ہے بڑا مشکل۔ ہر قوم، ہر ملک بلکہ انفرادی طور پر ہر انسان حیات کے چند اصول رکھتا ہے بہت کم ایسے اصول ہیں جو تمام انسانوں میں مشترک ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ حیات عامہ کے لئے کوئی مکمل ضابطہ یا لائحہ عمل بنانا انسان کے قبضۂ قدرت سے باہر ہے اس میں صلاحیت نہیں ہے کہ قانون کے شدائد کا احترام کرے اور اس کی نیت سے جائز فائدہ اٹھائے۔

میں خمار گندم کے ازالہ میں زیادہ آداب ملحوظ رکھنے کا عادی نہیں تھا۔ مگر اس قریہ میں اس نشہ سے مخمور ہونا تک گناہ تھا وجہ یہ تھی کہ "خمر" جائز طور پر بنا ہوا تھا۔ اور چونکہ میں یہاں کا باشندہ نہ تھا اس لئے اس سے محروم تھا مجھے آلودۂ لذت (آسودۂ لذت کیسے کہہ سکتا ہوں) ہونے کے لئے "چوری" کرنے کی ضرورت تھی جس کے امکانات بھی یہاں پر تقریباً معدوم تھے گاؤں سے باہر ایک بہت پرانا مندر واقع تھا جہاں میں شکار سے واپسی پر اکثر ٹھنڈا پانی پینے رک جایا کرتا تھا۔ اس مندر کے پروہت کے تین تنومند تندرست جوان لڑکے تھے اور ایک اسی قدر صحت مند لڑکی۔ مجھے پانی پلانے کی خدمت اس کے سپرد تھی لڑکے بالعموم کھیت پر ہوتے تھے صرف بوڑھا پروہت باہر ستی کے چبوترے پر پڑا رہتا تھا میں اس کے پاس ضرور رکتا تھا۔ اگر کبھی سیدھا چلا جاتا تو وہ محبت سے گالیاں دینے لگتا تھا۔

ایک روز مندر پر کوئی میلہ تھا گاؤں کے بہت سے مرد عورت جمع تھے اور پروہت بھی مع اپنے تینوں بیٹوں کے نہایت انہماک سے پوجا میں لگا ہوا تھا۔ میں شکار کو جا رہا تھا مگر گھوڑے پر سے اتر کر ستی کے چبوترے پر تماشا دیکھنے ذرا بیٹھ گیا۔ ابھی مجھے چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک جوان لڑکی تیزی سے مندر میں سے نکل کر آئی۔ اس کے تیور بدلے ہوئے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا روشن آسمان پر گھنگھور نے بادل آگئے ہوں اس نے آتے ہی میرے پیر میں ایک ٹھوسا دیا اور غصہ سے اپنی زبان میں بولی "ارے تم ستی دیوی کے چبوترے پر جوتے سمیت بیٹھ گئے ہو یا تو جوتے اتارو یا نیچے اترو" اس کے چہرے پر صحت کا خون چھلک رہا تھا میں نے پیار سے اس کی سادگی کو دیکھا اور بے پروائی سے بولا "تم کون ہوتی ہو

مجھے ٹوکنے والی، پروہت جی تو کچھ کہتے نہیں ہیں"
"میں کون ہوتی ہوں؟ میں پروہت جی کی بیٹی ہوں۔ بلاؤں بھیا کو وہ ابھی تمہاری ٹانگ پکڑ کر نیچے گھسیٹ لیں گے" اوہو یہ وہ لڑکی تھی جو روز مجھے پانی پلاتی تھی، لیکن شکل دیکھنے کی کبھی اجازت نہیں دیتی تھی آج اپنے ننھے سے مگر مستحکم اعتقاد کی توہین کے انتقام میں بیباکانہ میرے سامنے کھڑی باز پرس کر رہی تھی آخر میں نے ہنسکر کہا "اپنے بھائی کو کیوں تکلیف دیتی ہو تو تم ہی میری ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لو" اگر فائل کے آگے سر جھکا دیا جائے تو ضرور اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ میں رعشہ کی ایک خفیف سی حرکت پیدا ہو جاتی ہوگی۔ اس لڑکی کے خشمگیں تیور میں بھی ملائمت کا خفیف سا بال پڑ گیا تیز آواز سے بولی "کیا کروں روز تمہیں پانی پلاتی ہوں نہیں تو کر بتاتی"
"آج تم نے نیا جوڑا بدلا ہے یہ لال ڈوپٹہ تمہارے بدن پر کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے" میں نے چڑانے کے لئے مال کا کھوج نکال لیا تھا اب نیا راستہ صاف کر رہا تھا"
" جاتی ہوں بھیا کو بلا کر لاتی ہوں" اس نے سر سے آنچل اس انداز میں سرکایا کہ میں اس کے گلے میں انمل بے جوڑ کوڑیوں کی مالا بھی دیکھ لوں۔ عورت کتنی کمزور ہوتی ہے اپنے حسن کے ستائش کے باب میں۔
" اوہو تمہارے گلے میں یہ مالا کیسی پیاری ہے تم کتنی اچھی نظر آتی ہو اس کو پہن کر" تیور پر غصہ تقریباً سو چکا تھا۔ اِس اب لجا جاگتی جا رہی تھی حیا آتے ہی توہین مذہب کے انتقام کا مقدس فرض بھی نسائیت پر دانت پیستا ہوا رخصت ہو گیا اور ایک منٹ بعد ہی میری جانب سے گھونگھٹ نکالکر "عورت" چلدی"

اَب مندر کی چہار دیواری میں ایک گناہ آلودہ زبان سے گرمایا ہوا دل معیشت کوشی کی راہ پر پڑ چکا تھا مجھے تین دن تک مندر میں اس نے پانی نہیں پلایا تاکہ میں یہ سمجھ لوں کہ ستی کی بیحرمتی کی سزا ختم نہیں ہوئی ہے بڈھا ہی کراہتا ہوا اٹھتا اور اپنے لرزا ہاتھوں سے مجھے پانی پلا دیتا۔ چوتھے روز جب میں شکار سے واپس آیا تو ایک مرا ہوا تیتر چپکے سے مندر کی سیڑھیوں پر پھینکدیا اور پروہت کے پاس چبوترہ پر آ بیٹھا۔ میری اس حرکت کو اگر کوئی مہا سبھائی دیکھ پاتا تو وہیں سر پھوڑ دیتا یا جواباً فوراً مسجد میں گوشت پھینکنے کا ثواب عظیم حاصل کرنے کی کوشش کرتا اور اگر مسجد کے مولانا کو دیکھ لیتے تو فوراً ہی اعلان جہاد فرما دیتے۔
میری اس حرکت کو شاید مندر کی دیوی نے دیکھ لیا تھا تیتر کی ٹانگ پکڑ کر اپنے باپ کے پاس لے آئی اور میری طرف اشارہ کر کے اپنے باپ سے بولی
"یہ انھوں نے وہاں ڈالدیا تھا بابا"
بڈھے نے مردہ تیتر کو دیکھا اور ہنسکر بولا "جاؤ اسے دیجا کے جڑیوں میں جا کر ڈالدے ان کی اچھا ہوگی تو اس کی جان دیدیگی" مگر اس کا تو گلا کٹا ہوا ہے بابا۔ جان کیسے پڑے گی اِس میں" سمجھدار لڑکی نے اپنے باپ سے کہا۔
" تمہارے پاس سوئی ڈورا تو ہوگا نا۔ ذرا اس کا گلا سی دو" بڈھا ہنسنے لگا۔
طہارت پر پُر معصیت حملہ کرنے میں ایک خاص لذت ہے اگرچہ اس میں نقصان معصیت کا ہی ہوتا ہے مگر گناہ جارحیت پسند واقع ہوا ہے میں بھی اسکی معصیت کو لوٹنے کے درپے ہو گیا تھا۔
" اچھا اب بھیا جی کو لاکر پانی پلا" پروہت نے اپنی لڑکی سے کہا میں نے تین لوٹے پانی صرف کئے

آدھا پیا اور ڈھائی لوٹے سے کھیلتا رہا۔ پروہت حیرانی سے مجھے دیکھنے لگا۔ مگر اس کی لڑکی پیارو نے اس کھیل میں بدمزگی کا اظہار نہیں کیا۔

بڈھے کو آج کھانسی بہت تھی اس لئے میں رک گیا اس کو مندر میں لے گیا سینے پر تیل وغیرہ کی مالش کی تو اس کو ذرا سکون ہوا۔ بڑی دعائیں دینے لگا۔

"بھیا تم کہاں سے آئے ہو کون ملک کے رہنے والے ہو تم؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"میرا ملک یہاں سے بڑی دور ہے بابا کئی سو میل دور۔ جہاں ریلیں چلتی ہیں موٹریں دوڑی دوڑی پھرتی ہیں اور اس میں اتنے آدمی بستے ہیں کہ ان کی بھیڑ میں راستہ چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔

"ہاں میں بھی ایک بار ریل میں بیٹھا تھا اس وقت راہو (اس کا بڑا لڑکا) پیدا بھی نہیں ہوا تھا بڑی بری سواری ہے ریل۔ اس میں اتنے آدمی بھر جاتے ہیں کہ کھڑے رہنے کو بھی جگہ نہیں ملتی ہے دھرتی ماتا پہ کیسے کیسے بوجھ لاد دیئے ہیں لوگوں نے جبھی تو بھونچال آجاتے ہیں۔"

"پروہت جی کیا تمہارا جی نہیں چاہتا کہ تم کسی بستی میں جا کر بس جاؤ۔"

"نہیں بھیا۔ بڑی بستیوں کی الجھنیں ہماری سمجھ میں نہیں آئی ہیں وہاں لوگ بات بات میں لڑتے ہیں بھگوان کے مندر میں ہر ایک کو گھسنے دیتے نہیں۔"

"بابا روٹی کھالو ٹھنڈی ہو جائے گی۔ پیارو نے آکر کہا۔ "بھیا تم بھی کھالو۔" پروہت نے مجھ سے کہا۔

"نہیں راجو میرا راستہ دیکھ رہے ہوں گے اب مجھے چلنا چاہیئے کافی اندھیرا ہو گیا ہے۔"

"پیارو بیٹی مجھے بھی ابھی بھوک نہیں ہے۔ تھوڑی دیر میں کھاؤں گا میں بھی۔" اچھا میں دودھ دودھ لاؤں۔" اس نے اپنے باپ سے کہا۔

"میں بھی چلتا ہوں پروہت جی۔ تم آج لیٹے ہی رہنا ہلنا جلنا مت۔ نہیں تو پھر کھانسی اٹھ آئیگی"

"اچھا بھیا بھگوان تیرا بھلا کریں۔ جا۔ بڑا اچھا آدمی ہے تو۔"

میں مندر کے باہر نکل آیا چوطرف تاریکی پھیل چکی تھی دور سے گاؤں کی آگ جلتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ میں مندر سے آگے بڑھ کر مویشیوں کے احاطہ کے قریب پہنچا۔ تو وہاں پیارو ایک گائے کا دودھ نکال رہی تھی۔

"پیارو تم اب تک دودھ نہیں نکال چکیں؟" میں نے اس کے قریب آکر کہا۔

"نہیں" لوٹے کو نیچے رکھکر جواب دیا۔ "لاؤ ہم نکالیں دودھ" میں نے اس کے پاس بیٹھکر کہا۔

"تمہیں آتا ہے کیا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں ہاں" میں نے اس کے جسم کو چھو کر کہا۔ معصیت کے بھبکوں سے اندھیرا زیادہ کالا ہوتا جارہا تھا جس میں معصومیت اتنی دھندلی پڑگئی تھی جیسے گہرے کنوئیں میں پانی تارا نظر آتا ہے آخر گناہ کی ایک پھنکار سے یہ تارا بھی غائب ہو گیا۔

آج کی شام میری لذت آلودگی کی شام تھی جبکی شب نے میرے اندر سے روز آنہ کا جذباتی سکر بہت بڑی حد تک زائل کر دیا تھا۔ میری خو کی ضد پوری ہو چکی تھی یہاں کی شریعت حیات میں یہ شائد پہلا کفر تھا جس کی عفونت سے میرے اسفل احساسات مست ہو رہے تھے۔ بیدینی معمولات مسلمہ سے روگردانی کا نام ہے لیکن "معمولات" مہذب بستیوں میں جاکر اپنی بدہیت کو بدل ڈالتے ہیں چنانچہ میں بھی

اصول پرست گرنا آشنا رحقائق مخلوقات کی نگاہ میں ابھی بیدین نہیں ہوا تھا کیا ہوا اگر سرسی کی مختصر سی بستی کے قوانین کی رو سے میں کافر ہو گیا ہوں۔ یونہی ہم سلح کے قوانین بناتے آئے ہیں یونہی اپنے ہاتھوں پر ان کی توہین کرتے رہتے ہیں اور جب تک سوسائٹی اور سیاست کی ایجاد انسان کے سپرد رہے گی یہی ہوتا چلا جائے گا اگر انسانیت اس کی متحمل نہیں ہوتی ہے تو اس کو آسمانی قانون و ضابطہ ڈھونڈنا چاہیئے۔

میرا شوس گناہ پیارو کے مستقبل کو سیاہ کر چکا تھا۔ پیارو کے اقربا میری جان کے لاگو بن چکے تھے ریاست کی خوشگوار و کشادہ فضا میری گرداذیت آفریں حصار تنگ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ چنانچہ ایک اندھیری رات سے فائدہ اٹھا کر میں اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور یہاں سے نکل بھاگا انسان اگر اپنے ہی جیسے انسانوں میں سیاہ کھیل کھیلتا رہے تو اس کا نباہ ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ ناسازگار ماحول میں بھی اپنے طریق عمل پر کاربند رہتا ہے تو اس پر عرصہ حیات تنگ ہو جاتا ہے اچھی باتیں نامساعد فضاء میں زخم کھاتی ہوئی زندہ رہ جاتی ہیں مگر بڑی باتیں اکثر اچھے ماحول میں دم توڑ دیتی ہیں بوہیت کی سرائندمیں محمدیت کا دم نہ گھٹ سکا تھا لیکن جب محمدیت کی خوشبو تند اٹھی تو اس میں بوجہلیت کی تعفن نہ بچ سکی تھی۔

اس ناقابل اعتنا واقعہ کے عرصہ دراز تک میں دنیا میں ادھر ادھر گھومتا رہا حتیٰ کہ سرسی اور پیارو دونوں کو بھول گیا بیس سال بعد میں ایک دفعہ جنوبی ہند کی طرف ایک پہاڑی علاقہ میں ریل کے اندر سفر کر رہا تھا کہ شام کے وقت ایک بڑا اسٹیشن آیا میں نے باہر سر نکال کر جھانکا تو تختہ پر نظر پڑی۔ اسٹیشن کا نام سرسی تھا میں دیوانہ وار اتر پڑا اور باہر نکل کر پھٹے پھٹے دیدوں سے ہر شے کو دیکھنے لگا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی یہ تو وہی مقام تھا جہاں میں بیس سال پہلے شکار کے لیے آیا کرتا تھا میں لپک کر گاڑی میں آیا جلد جلد اپنا اسباب اتروایا اور ایک عمدہ سے تانگے میں شہر کی طرف روانہ ہوا تانگے والے سے مجھے معلوم ہوا کہ یہاں سے اٹھارہ سال سے ریلیں دھڑ دھڑاتی ہوئی گزر رہی ہیں یہاں پر کانچ کی ریت کا زبردست خزانہ برآمد ہوا ہے چنانچہ گورنمنٹ نے تین عظیم الشان گلاس فیکٹریاں قائم کی ہیں جن میں سیکڑوں آدمی کام کرتے ہیں بہت سے انگریز آباد ہیں اور اب یہاں کی آبادی پچاس ہزار کے قریب ہے۔

میں کشادہ بازاروں، سربفلک عمارتوں اور ان تمام تحیر خیز چیزوں کو دیکھتا ہوا گزر رہا تھا جن کو سرمایہ پیدا کر دیا کرتا ہے میری نظروں سے مسلم ہائی اسکول، سناتن دھرم کالج، خالصہ ملٹری اسکول، آریہ پرنٹنگ پریس وغیرہ گزر رہے تھے۔ میں نے یہاں آکر مسجدوں کے سامنے سے پولیس کی حفاظت میں مذہبی جلوس باجہ کے ساتھ نکلتے دیکھے میں نے یہاں انقلاب زندہ باد کے نعرے سنے میں نے اپنے اس دوران قیام میں ہند و مسلم فسادات کے تماشے دیکھے مجھے یہاں کلکتہ کے بہو بازار کی طرح طوائفوں کے بے شمار کوٹھے نظر آئے۔ اور جس ہوٹل میں میں مقیم تھا اس کے منیجر نے مجھ سے پیارو چکلہ دار کی سب سے زیادہ تعریف کی جس کے ہاں ہر وقت تازہ اور نیا مال ملتا تھا۔

یہاں ریل کی وجہ سے کھانے پینے اور پہننے کی اشیاء کی اب بیحد فراوانی تھی قیمتی اشیاء اور

دیگر ضروریات کی بھی اس قدر بہتات تھی کہ مِل کے مزدور سے لیکر گورنمنٹ آفیسر تک کے لئے وہ لازمۂ حیات بن گئی تھیں۔

یہاں اب رات دن دنگے فساد ہوتے رہتے تھے روز آنہ چوریاں ہوا کرتی تھیں کثرت سے فحش کاری تھی غرض انسانیت گروہوں میں تقسیم ہو کر عام انسانیت کا خاتمہ کر چکی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ ریل اور موٹر یہاں بھر بھر کر تہذیب لائیں اور تہذیب ہر شئے کی فراوانی۔ اب ہر شئے انسان کی روز آنہ کی ضروریات سے زیادہ موجود تھی کثرت سے غلہ آچکا تھا۔ بیحد کپڑا آچکا تھا۔ ہر شئے لائی جا چکی تھی۔

یعنی تہذیب نے اس بستی کے اندر باہر سے لاکر سامان جنگ جمع کر دیا تھا۔

سرستی کے باہر اب بھی وہ بوسیدہ مندر موجود تھا جہاں بیس سال پہلے آکر بیں گناہ کی منڈی کھول گیا تھا۔ بوڑھے پروہت کے دو تنومند لڑکے آتشک سے مر چکے تھے اور تیسرا کثرت عیاشی و شراب نوشی کی وجہ سے دق میں مبتلا ہو کر مندر میں پڑا کھانسا کرتا تھا۔ غرض ہر طرف شیطانی ناچ نظر آرہا تھا۔ اب یہاں فرشتوں کے وجود کا کوئی قائل نہ رہا تھا۔

ملاحظہ ہو بقیہ (صفحہ ۴۸) کا۔ اِن سوالات کا جواب "جلوۂ رنگین" میں ملاحظہ کیجئے۔ جہاں زخمی اور تندرست جذبات کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دے گا۔

قیمت:۔ تین روپیہ۔ مجلد رنگین گرد پوش۔

نگینے:۔ مصنفہ مظفر حسین شمیم۔

افسانوں، ڈراموں، اور مضامین کا شاندار مجموعہ افسانے جن میں ڈراموں کی کشاکش، ڈرامے جن میں افسانوں کا سکون، مضامین جن میں افسانوں کا سکون اور ڈراموں کی کشاکش کا حسین امتزاج۔

اسلوب نگارش کی جدت، زبان کی خوبیاں، روزمرہ اور محاورہ کا لطف دیکھنا ہو تو نگینے ملاحظہ فرمائیے۔

قیمت:۔ دو روپیہ بارہ آنہ مجلد رنگین گرد پوش۔

تعبیریں:۔ مصنفہ محمد امین شرقپوری۔

محمد امین شرقپوری ادنیٰ طبقہ کے سب سے بڑے نقیب ہیں۔ وہ مظلوم طبقہ سے اپنے افسانوں کا مواد حاصل کرتے ہیں۔ فلاکت زدہ انسانوں اور معاشرت کے آہنی پنجوں میں گرفتار شدہ انسانوں کے مصائب کو عمیق مطالعے کی نظر سے دیکھتے ہیں ان کا دل سماج کی ہر ٹریجڈی پر دھڑکتا ہے۔ اور ان دھڑکنوں کو کچھ اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ دل و دماغ کی گہرائیوں تک اترتی چلی جاتی ہے۔ پڑھنے والے کے چہرے پر کہیں مسکراہٹ اور کہیں غم کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ زندگی کا یہ امتزاج ان کے تازہ افسانوں میں عروج پر ملیگا۔

قیمت:۔ دو روپیہ چودہ آنہ۔ مجلد رنگین گرد پوش۔

ہچکیاں:۔ مصنفہ صدیقہ بیگم سیوہاروی۔

ہچکیاں موت کے وقت بھی آتی ہیں۔ اور خوشی کے وقت بھی شاید آنسوؤں سے ہچکیوں کا رشتہ اتنا ہی ہے۔ جتنا قہقہوں سے، یہ افسانے نہیں ہیں بلکہ انسانیت کی وہ ہچکیاں ہیں جو آنسوؤں کے تار سے باہم پرو کر مالا بنادی گئی ہے۔ اس میں دہکتی ہوئی بھوک، مسکراتی ہوئی موت، اور اس پورے غلط نظام تمدن پر نفرت کی نظر ڈالتا ہوا قہقہہ، سب کچھ نظر آئے گا۔ قیمت۔ تین روپیہ چار آنہ مجلد۔

ذکر جمیل۔ مصنفہ ماہر القادری

قیمت:۔ ایک روپیہ بارہ آنہ مجلد۔ رنگین گرد پوش۔

جذبات

جذب عالم پوری

رازِ ہستی ذرا نہیں معلوم　　یہ معمہ ہے کیا، نہیں معلوم
کیوں جفا مجھ پہ روز کرتے ہو　　کیا مآل جفا نہیں معلوم
اہل کعبہ سے، دیر والوں سے　　کس سے خوش ہے خدا نہیں معلوم
کیا بتاؤں میں انتہا اپنی　　جب مجھے انتہا نہیں معلوم
اِک جھلک انکی میں نے دیکھی تھی　　بعد ازیں کیا ہوا نہیں معلوم
رنجش بے سبب سے الجھن ہے　　مجھ سے کیوں ہو خفا نہیں معلوم
مجھے مطلب ہے سجدہ کرنے سے　　بت ہے یا وہ خدا نہیں معلوم
ڈھونڈتا پھر رہا ہوں میں اس کو　　جس کے گھر کا پتا نہیں معلوم
اس سے محدود ہے سوال ترا　　اس کی شانِ عطا نہیں معلوم
اس پہ ہے اعتمادِ چارہ گری　　جسے دل کی دوا نہیں معلوم

جذبؔ میں علم حق کا پرتو ہوں
اور اِس کے سوا نہیں معلوم

ہماری تازہ مطبوعات

زلزلے:- قدوس صہبائی بی۔ اے۔ آنرز۔ افسانوں کا مجموعہ
ملکوں میں زلزلے آتے ہیں تو در و دیوار اور دشت کانپتے ہیں۔ لیکن جب دلوں اور دماغوں میں آتے ہیں۔ تو تمدن کی بنیادیں اور تہذیب کی سر بفلک عمارتیں کانپتی ہیں۔ ادیب کے ذہن رسا اور خیالات کی دنیا میں جب زلزلے آتے ہیں تو ان کی لرزشیں صفحۂ قرطاس پر مرتسم ہو جاتی ہیں۔ اور نقش و نگار عالم کی لرزش کا سبب بن جاتی ہیں۔ ایسے ہی چند بیش بہا لرزشوں کے نقش آج آپ کے سامنے پیش ہیں۔

کتابت و طباعت اعلیٰ۔ مجلد رنگین گردپوش۔ قیمت:۔ دو روپیہ بارہ آنے۔

سیلاب:- احمد ندیم قاسمی۔ (افسانوں کا مجموعہ)
قاسمی واقعہ کا انتخاب زندگی سے کرتے ہیں۔ دکھ درد سے کراہتی زندگی، مسرّت کے آغوش میں ہنستی کھیلتی زندگی۔ محبت میں بے قرار اور غم روزگار سے گھری ہوئی زندگی، جس میں لوگ چوٹ کھاتے ہیں۔ چوٹ دیتے ہیں۔ روتے بسورتے ہیں۔ قہقہے لگاتے ہیں۔ کامیاب ہوتے ہیں۔ ناکام رہتے ہیں۔ فرشتے بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ شیطان بن جاتے ہیں۔ لغزش کھا کر گرتے ہیں۔ سنبھل جاتے ہیں۔ قاسمی نے ایسے ہی خاکوں میں رنگ بھرا ہے۔ اور اپنی نقوش کو ابھارا ہے۔

کتابت طباعت اعلیٰ۔ مجلد۔ رنگین گردپوش۔ **قیمت**:۔ تین روپیہ آٹھ آنے

انگڑائیاں:- منتخبہ احمد ندیم قاسمی (افسانوں کا مجموعہ)
یہ مجموعہ ہندوستان کے پندرہ مشہور افسانہ نگاروں کے شاہکار افسانوں کا خوبصورت مجموعہ ہے ان افسانوں کا منتخب کرنے والا خود بھی افسانہ نگاروں کی اس نئی جماعت میں شامل ہے۔ اس لئے اس کی نگاہِ انتخاب کی صحت مسلم ہے۔

اس مجموعہ میں عریان اَدب کو دخل ہے نہ بے محل تقریر بازی کو، یہ افسانے زندگی کے اس ہیرے کے مختلف پہلو ہیں۔ جسے اردو افسانہ نگاروں نے تراشا ہے۔

کتابت و طباعت اعلیٰ۔ مجلد۔ رنگین گردپوش۔ **قیمت**:۔ تین روپیئے چار آنے

زندگی کی ٹھوکریں:- رئیس احمد جعفری۔ (افسانوں کا مجموعہ)
ان افسانوں کا ہر افسانہ زندگی کا آئینہ دار ہے۔ وہ زندگی جو ہم سب گزار رہے ہیں جو ہم سب کے سامنے گزر رہی ہے۔ جسے ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں جس کا نغمہ اور نوحہ ہمارے کان زور سے سنتے رہتے ہیں۔ جس کی ناکامی اور حرمان نصیبی پھر جس کی کامیابی اور کامرانی ہمارے دماغ میں بسی رہتی ہے۔ جسے ہم کبھی یکسر خندۂ و قہقہہ اور

کبھی آہ و بکا کی صورت میں دیکھتے ہیں۔

کتابت و طباعت اعلیٰ۔ مجلد۔ رنگین گردپوش۔ قیمت۔ تین روپئے چار آنہ

از منظور بخاری۔ بی۔ اے

تقدیریں :- انسانی زندگی میں کیسے کیسے جوہر پوشیدہ ہیں۔ اور دنیا میں انسان نے کبھی کیسی مشکلات پر قابو پاکر ترقی کی، بڑے بڑے انسانوں کی ایجادیں اور تصنیفیں کس طرح ظہور پذیر ہو سکیں۔ وہ کیا حالات ہیں جس سے کسی انسان میں بڑا بننے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ کیوں اور کس طرح کوئی انسان یک بہ یک ہماری نگاہوں میں ممتاز شخصیت بن جاتا ہے۔ ایسے روح پرور سوالات کا جواب آپ کو تقدیریں دے سکتی ہیں جس سے آپ پر ظاہر ہوگا کہ کس طرح آج کا حقیر پیشہ ور کل کا ذی مرتبت انسان بن گیا ——— قیمت۔ ایک روپیہ۔

قدوس صہبائی۔ بی۔ اے (آنرز) (افسانوں کا مجموعہ)

کروٹیں :- کروٹیں کئی قسم کی ہوتی ہیں۔ درد بھری زندگی بھی کروٹیں لیتی ہے، اور مچلتی ہوئی جوانی بھی، زمین بھی کروٹیں لیتی ہے اور آسمان بھی، دنیا کروٹیں لیتی ہے تو زار و زاریت تہ و بالا ہو جاتی ہے اور آسمان کروٹیں لیتا ہے تو آبادی ویرانوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

قدوس صہبائی نے ایسی بہت سی محسوس و غیر محسوس کروٹیں افسانوں کی شکل میں صفحات پر مرتسم کی ہیں اور کس وقت میں کی ہیں۔ جبکہ خود مصنف جیل خانہ کی تنگ و تاریک کوٹھری میں بے تابی کے ساتھ کروٹیں لے رہا تھا

کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ ——— قیمت :- دو روپیہ بارہ آنے

از ماہر القادری۔ (ناول)

کردار :- کردار نگار کا معجزہ۔ نفسیاتی تحلیل کا نقش رنگیں، انسانی زندگی کی صحیح تفسیر، پاکیزہ محبت، دلچسپ رومان۔ تہذیب مغربی پر چبھتی ہوئی طنز سوسائٹی کی سچی تصویر۔

کتابت و طباعت اعلیٰ۔ مجلد۔ رنگین گردپوش۔ قیمت :- دو روپئے چار آنے۔

از ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری۔

ادب اور انقلاب :- اردو کے ادبی انقلاب کے سب سے ممتاز علم بردار کے ان مقالوں کا مجموعہ جنھوں نے ہماری تنقید نگاری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

اس مجموعہ میں وہ تاریخی مقالہ "ادب اور زندگی" شامل ہے جس نے ادبی دنیا میں ہلچل مچادی تھی اور ترقی پسند تحریک کی بنا ڈالی تھی۔ اس کے ساتھ بنگال کے باغی شاعر قاضی نذر الاسلام، اور سوویٹ روس کے ادب پر وہ سیر حاصل مضامین ہیں جنھوں نے ہمارے شاعروں اور ادیبوں کے دل و نگاہ کو وسعت بخشی۔ کتاب کے شروع میں ایک اعلان نامہ ہے جو پنڈت جواہر لال نہرو، منشی پریم چند مرحوم، مولوی عبد الحق، اور مصنف کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ قیمت :- تین روپئے آٹھ آنے۔ مجلد۔ رنگین۔ گردپوش۔ کاغذ و طباعت اعلیٰ۔

ادارۂ اشاعت اردو عابد روڈ حیدرآباد دکن

ادارۂ اشاعت اُردو کی ہردلعزیز مطبوعات

کتابوں کی قیمتیں سکّہ انگریزی (کلدار) درج ہیں

(جدید اڈیشن)	پائی	آنہ	روپیہ
روح اقبال۔ ڈاکٹر یوسف حسین۔	۰	۱۲	۵
فکر اقبال۔ غلام دستگیر رشید	۰	۰	۴
آثار اقبال ″ ″	۰	۱۲	۳
فلسفۂ عجم۔ علامہ اقبال (جدید اڈیشن)	۰	۲	۳
داستان اردو۔ نواب نصیر حسین خیال	۰	۱۲	۱
تنقیدی جائزے۔ احتشام ″	۰	۱۲	۳
نگارشات محمد علیؒ۔ رئیس احمد جعفری	۰	۱۲	۳
سراب۔ مجنوں گورکھپوری	۰	۶	۳
صید زبوں۔ ″ ″	۰	۰	۲
سرنوشت۔ ″	۰	۰	۲
وسوسے۔ مفضل حق قریشی	۰	۱۲	۲
میخانۂ ریاض۔ تسنیم مینائی	۰	۴	۳
خطباء۔ قیسی رامپوری	۰	۰	۲
نگینے مظفر حسین شمیم	۰	۱۲	۲
تعبیریں محمد امین شرقپوری	۰	۱۲	۲
جلوۂ رنگین ڈاکٹر محمد نصیر الدین	۰	۰	۳
ہچکیاں صدیقہ بیگم سیوہاروی	۰	۴	۳
ذکر جمیل ماہر القادری	۰	۱۲	۱
معاشیات پاکستان عبدالقدوس ہاشمی	۰	۸	۱
نفسیات زندگی شیر محمد اختر	۰	۱۲	۱
بچوں کی نفسیات ″ ″	۰	۱۲	۱

	پائی	آنہ	روپیہ
سزا۔ قیسی رامپوری	۰	۴	۲
اسرار علی اختر	۰	۱۲	۲
دھوپ قیسی رامپوری	۰	۴	۳
نانسیت شاہد حسین رزاقی	۰	۱۲	۲
خطباء قیسی رامپوری	۰	۰	۳
مکالمات ابوالکلام عقیل احمد جعفری	۰	۱۲	۳
اسلامی تہذیب کیا ہے غلام دستگیر رشید	۰	۸	۲
غبار قیسی رامپوری	۰	۸	۲
تنقیدی حاشیے مجنوں گورکھپوری	۰	۱۲	۳
مسکراہٹیں کوثر چاندپوری	۰	۱۲	۲
ہمایوں نامہ احمد الدین	۰	۰	۲
داستان کربلا سعید صدیقی	۰	۸	۲
افادات محمد علی رئیس احمد جعفری	۰	۱۲	۳
کروٹیں قدوس صہبائی	۰	۱۲	۲
قصص و مسائل مولانا عبدالماجد دریابادی	۰	۱۲	۱
ضربیں قیسی رامپوری	۰	۰	۳
زلزلے قدوس صہبائی	۰	۱۲	۲
انگڑائیاں احمد ندیم قاسمی	۰	۴	۳
سیلاب ″ ″ ″	۰	۸	۳
زندگی کی ٹھوکریں رئیس احمد جعفری	۰	۴	۳

کتاب	روپیہ	آنہ	پائی
کردار ۔ ماہر القادری	۲	۴	۰
رنگین سپنے کوثر چاندپوری	۲	۱۲	۰
ادب اور انقلاب ۔ ڈاکٹر اختر حسین رائپوری	۳	۸	۰
گرداب ۔ احمد ندیم قاسمی	۳	۱۲	۰
لہریں ۔ ڈاکٹر شفیق الرحمان	۳	۱۲	۰
افسانے اور ڈرامے سعادت حسن منٹو	۲	۱۲	۰
زندگی کے نئے زاویے رئیس احمد جعفری	۳	۰	۰
مضامین عبدالماجد دریابادی	۴	۴	۰
محمد علی ۔ مولانا عبدالماجد دریابادی	۲	۱۲	۰
مردوں کی مسیحائی ۔ " " "	۴	۴	۰
یقین و عمل ۔ عبدالقدوس ہاشمی	۲	۸	۰
مقالات محمد علی ۔ مرتبہ رئیس احمد جعفری	۳	۱۲	۰
مقالات " حصہ دوم " " "	۳	۱۲	۰
رنگ محل ساغر نظامی	۳	۱۲	۰
نغمات ماہر ماہر القادری	۳	۰	۰
محسوسات ماہر " "	۳	۰	۰
ٹیگور اور انکی شاعری مخدوم محی الدین	۱	۸	۰
کاروان علم ۔ فیض محمد بادشاہ حسین	۳	۰	۰
تعمیریں منظور بخاری	۱	۰	۰
ہٹلر کا نیا نظام امتیاز حسین بی اے	۰	۱۰	۰
خدا اور کائنات ۔ ماہر القادری	۰	۹	۰
خواتین دکن ۔ عطاء الرحمن	۲	۰	۰

کتاب	روپیہ	آنہ	پائی
شادی و محبت ۔ مقصودہ فرحت	۰	۱۲	۰
تذکرۂ یورپین شعرائے اردو محمد سردار علی	۰	۱۲	۰
پریم پجارن ۔ قدوس صہبائی	۰	۱۴	۰
ستاروں پر زندگی کے امکانات محمد عبدالرحمن	۰	۹	۰
بخارا کا جمہوری انقلاب	۰	۹	۰
ترکستانی خاتون شاہراہ انقلاب پر	۰	۹	
مرد انقلاب (شہزادہ کروپاٹکن کے حالات)	۰	۱۲	
اقبال کا تصور زمان و مکان ڈاکٹر رضی الدین صدیقی	۰	۱۲	
سیاست جاپان ۔ علی امام بلگرامی	۰	۱۰	۰
اقبال کے خطوط جناح کے نام	۰	۶	۰
ابن خلدون کے سیاسی و معاشرتی نظریے پروفیسر عبدالقادر سروری	۰	۶	
جمہوریۂ چین ۔ میر عابد علی خاں	۱	۱۲	۰
گاندھی عروج	۰	۱۲	۰
گاندھی جناح مراسلت ۔ ضیائی	۰	۱۲	۰
جنات کی دنیا ۔ مقبول سیوہاروی	۱	۴	۰
ہندوستان کا بڑا شاعر اور محسن	۱	۸	۰
مجنوں کے خطوط ۔ عطاء الرحمن	۲	۸	۰
کاشانۂ نادر ۔ "	۱	۱۲	۰

ملنے کا پتہ

سید عبدالرزاق بک سیلر و پروپرائٹر ادارۂ اشاعت اردو

عابد روڈ ـــ حیدرآباد ـــ (دکن)

اِدارۂ اِشاعت اردو کی نئی کتابیں

روحِ اقبال:- مصنفہ ڈاکٹر یوسف حسین خانصاحب پروفیسر (جامعہ عثمانیہ)

ڈاکٹر یوسف کو اقبال کے کلام سے والہانہ شغف ہے اور انھوں نے اس کے ہر پہلو کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اگرچہ یہ کتاب بظاہر صرف تین مقالوں پر مشتمل ہے جو اقبال اور آرٹ، اقبال کا فلسفۂ تمدن اور "اقبال کے مذہبی اور مابعد الطبیعی تصورات" پر لکھے گئے ہیں۔ لیکن ان کے ضمن میں کلام اقبال کے تقریباً تمام پہلوؤں پر روشنی پڑ گئی ہے۔ شاعری اور فنون لطیفہ کے بارے میں اقبال کا نقطۂ نظر تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اقبال کے شاعرانہ مسلک پر جو رومانیت، رمزیت، اور کلاسیکیت کے امتزاج پر مشتمل ہے، طویل بحث کی ہے اور اس کو سمجھانے کے لئے اقبال کے چند موضوع مثلاً شیطان اور آدم، ابلیس اور جبریل، حور و شاعر، مسجد قرطبہ وغیرہ پیش کئے ہیں۔ اقبال کے کلام کا فنی تجزیہ کرکے اس کے امتیازی خصوصیتوں مثلاً شاعرانہ مصوری، ندرتِ تشبیہات، اثر آفرینی وغیرہ کو واضح کیا ہے۔ اِنفرادی اور اجتماعی خودی کے متعلق اقبال کے اصول بیان کئے ہیں۔ علم حاصل کرنے کے لئے تاریخی استقرار اور تسخیر فطرت کے لئے سائنس اور حکمت کی ضرورت کو ظاہر کیا ہے۔ زندگی کے مقصد اور فرد اور جماعت کے ربط کی وضاحت کی ہے۔ مملکت تمدن، معاشی، اور معاشرتی نظام کے متعلق اقبال کے تصور کو پیش کیا ہے۔ خدا کے وجود اور توحید کے متعلق وہ بنیادی خیالات درج کئے ہیں۔ جن پر اقبال کی ساری تعلیم کا دارومدار ہے۔ زمانہ، تقدیر اور جبر و اختیار کے مسئلوں پر بحث کی ہے اور آخر میں حیات و موت کے متعلق لطیف نکتے واضح طور پر پیش کئے ہیں۔

قیمت:- پانچ روپیہ بارہ آنے مجلد رنگین۔ گرد پوشش۔

فکرِ اقبال:- مرتبۂ غلام دستگیر رشید ایم۔ اے۔

اِقبال! عالم اسلام کا وہ مفکر اعظم جس کے حقیقت افروز پیام، جس کے روح افزا کلام، اور جس کے حیات افروز فلسفہ نے مرد مومن، اور بندۂ مسلم کو ایک نئی زندگی سے روشناس کرایا۔ وہ زندگی جو اصل اسلام ہے۔ جو صرف اسلام کے لئے ہے۔ جسے لوگ جانتے ہیں لیکن سمجھتے نہیں۔

اِقبال کے فلسفہ، اس کے کلام، اور اس کے پیام کو اگر آپ سمجھنا چاہتے ہیں۔ پرکھنا چاہتے ہیں۔ تو فکرِ اقبال کا مطالعہ کیجئے۔ یہ کتاب شاعر مشرق کے تاثرات و جذبات، افکار و خیالات، اور جوش گفتار کا ایک نہایت مکمل مجموعہ ہے۔

قیمت۔ چار روپیہ مجلد رنگین گرد پوش

آثارِ اقبال:- از غلام دستگیر رشید۔ ایم۔ اے۔

کیا سچی بات کہی تھی علامہ اقبال نے کہ

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اہل چمن کی انتہائی بدنصیبی ہوتی اگر "دیدہ ور" کے نغموں کو بھول جاتے۔ لیکن اہل چمن نے علامۂ اقبال کے نغموں کو نہیں بھلایا اور شاید کبھی نہیں بھلا سکیں گے۔ ابتک

اقبال کی زندگی اور ان کے افکار پر اتنا لکھا جا چکا ہے کہ اقبال کا مطالعہ کرنے والا کئی درجن کتابوں کا محتاج ہو گیا۔ جناب مرتب کا سب سے اہم احسان ہے کہ انھوں نے ایسے مضامین کو جن کے بغیر اقبال کو اچھی طرح نہیں سمجھا جا سکتا یکجا کر دیا۔ اب ایک کتاب "افکار اقبال" کے ذریعے آپ کو تقریباً تمام مشاہیر اہل قلم کے رشحات قلم سے واقفیت ہو سکتی ہے۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اب تک اقبال پر اس سے جامع اور مفید کتاب نہیں لکھی گئی۔ انتخابات مضامین کے لئے فاضل مرتب کا نام ضمانت ہے کہ اس میں صرف جواہرات ہیں سنگریزے نہیں۔

قیمت:- تین روپیہ بارہ آنہ مجلد رنگین گردپوش۔

از پروفیسر سید احتشام حسین۔

تنقیدی جائزے:- لکھنؤ یونیورسٹی۔

یہ مجموعہ مضامین شاعروں اور ادیبوں کے لئے دعوت فکر ہے۔ اس میں علوم جدیدہ کی روشنی میں ادبی روایات اور تغیرات کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے شعر و ادب کی سماجی بنیادوں کا تجزیہ حکیمانہ اصول نقد کی مدد سے کیا گیا ہے۔ جو لوگ ادب کو محض تفریح کی چیز نہیں سمجھتے وہی اس کتاب کا مطالعہ کریں۔

قیمت:- تین روپیہ بارہ آنہ مجلد۔ رنگین گردپوش

مصنفہ مجنوں گورکھپوری۔

صید زبوں:- صید زبوں ایک افسانہ ہے۔ انہی دنیا کے افراد کا، جو جبر و قدر اور غلط سماجی نظام کے شکار رہیں۔

صید زبوں زخمی دلوں کی دھڑکنوں، مجروح روحوں کی پکار، اور کشتہ و بسمل انسانوں کے اضطراب کی ایک مکمل تصویر ہے۔ بظاہر یہ ایک مسلسل و طویل افسانہ ہے لیکن حقیقتاً یہ ایک لمبی اور سرد سانس ہے۔

قیمت:- دو روپیہ مجلد رنگین گردپوش۔

سرنوشت:- مجنوں گورکھپوری۔

سرنوشت ایک ایسا ادب ہے۔ جس میں جیتی جاگتی زندگی موجود ہے۔ ایک ایسا دلدوز افسانہ جس کی تخلیق میں آہوں اور دل پاروں سے کام لیا گیا ہے۔ اس کے پیش لفظ میں حضرت مجنوں نے سب سے پہلے یہ شعر لکھا ہے۔ ؎

کون سے زخم کا کھلا ٹانکا
آج پھر دل میں درد ہوتا ہے

قیمت:- دو روپیہ۔ مجلد اور رنگین گردپوش

جناب فضل حق قریشی۔

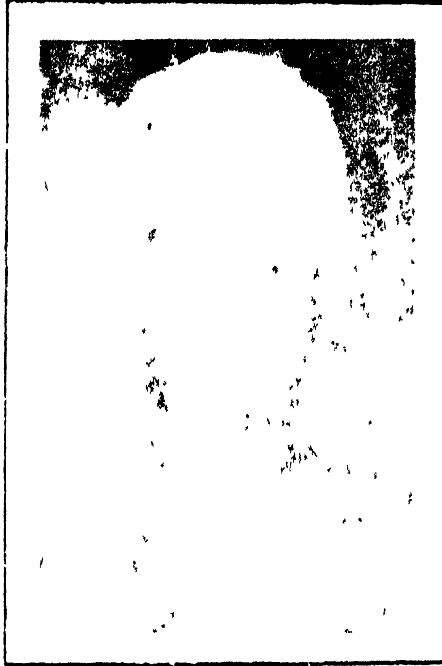
وسوسے:- فضل حق قریشی۔ اسی دنیا میں انھیں واقعات اور حادثات کی بنیادوں پر رنگین و دلکش اور حیرت افزا افسانوں کی تخلیق و تعمیر کرتا ہے۔ انسانی نفسیات کی مکمل تشریح کرتا ہے۔ لاینحل ذہنی افکار، سنسنی پیدا کرنے والے حادثات زندگی کی بھیانک مگر دلچسپ تصویریں، ضمیر کی کشمکش، روح کی مظلومیت سیرت انسانی کے مد و جزر، زندگی کے اسرار و رموز کی نقاب کشائی کے لئے مصنف اپنا قلم اٹھاتا ہے۔ اور تعجب خیز طریقہ پر کامیاب ہوتا ہے۔ بارہ حیرت افروز افسانوں کا یہ شاندار مجموعہ جو اپنے مخصوص طرز انشاء اور اختصاصی موضوع (مطالعہ ذہن انسانی) کے اعتبار سے اردو ایک نئی چیز ہے۔ ہر افسانے کے اختتام پر آپ سوچیں گے کہ کاش کہانی ابھی ختم نہ ہوتی!

قیمت:- دو روپیہ بارہ آنہ مجلد۔ رنگین گردپوش۔

مصنفہ ڈاکٹر محمد نصیر الدین۔

جلوۂ رنگین:- زندگی افسانہ سے شروع ہوتی ہے۔ اور حقیقت پر ختم ہوتی ہے یہ جب اپنی حقیقت محسوس کرتی ہے تو کیسی چھوٹی اور اداس شے ہو جاتی ہے۔ زندگی جب اداس ہو جائے تو اسے خوش بھی کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ کیا ایک ڈاکٹر اپنے نشتر کی نوک سے کبھی کبھی ایسا کر سکتا ہے یا نہیں؟ (باقی)

علی محمد
مقالات



علی محمد
مقالات



ادارہ
اشاعت اُردو
حیدرآباد (دکن)

ادارہ اشاعت اُردو حیدرآباد دکن